رجسٹرڈ نمبر اے ۳۴۶

نگار

[illegible]

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرتِ نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ۔ اس میں اکثر و بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں۔ مجلد نہایت عمدہ طباعت کاغذ اور نفیس گردپوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز (دو حصے)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں جن کے سامنے خطوط غالب پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا اور ۳۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔

اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب (حصہ ۲ ۔ ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے

اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے بلکہ راجاؤں کے اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے۔ اس ڈرامہ نے وہ حقیقی خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ جھانسی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب اہل الکہف کا ترجمہ ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے ترجمہ حضرتِ نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین اگست سنہ ۴۷ء	شمارہ ۲

ملاحظات ---------------- ۲

تکرار تاریخی ------ ولی کمال خاں ام۔ اے۔ ۵

اجتماعیت کے نئے رجحانات --- محشر تونسوی ام۔ اے۔ ۱۷

آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا --- اسحاق لکھنوی ---- ۲۰

انشاؔء کی شاعری ---- رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ) ۲۹

قدیم سنسکرت لٹریچر --- ا۔ ح --- --- ۳۷

مکتوبات نیاز ------------ ۴۶

مالہٖ وما علیہ ---------------- ۴۹

باب الاستفسار والمناظرہ ---------- ۵۲

حیوانیات۔ (بعض دلچسپ حقائق) ---- ۵۴

قانون وانصاف (نظم) --- ریحان الحسن فاروقی -- ۵۸

کلام ادیب سہارنپوری --------- ۵۹

کلام ندیم جعفری، ڈیرہ غازی خاں ------ ۶۰

آیندہ سالنامہ کیا ہونا چاہئے؟

ہمارے سامنے چند صورتیں ہیں:-

۱- پورا پرچہ ذوق کے لئے مخصوص ہو

۲- مکتوبات نیاز سنہ ۴۲ء سے لیکر اسوقت تک کے یکجا کردئے جائیں، جو ابھی تک کتابی شکل میں شایع نہیں ہوئے یہ گویا مکتوبات کی تیسری جلد ہوگی

۳- سنہ ۳۶ء سے اسوقت تک کے تمام استفسارات وجوابات شایع کئے جائیں جو ابھی تک کتابی شکل میں شایع نہیں ہوئے۔ یہ گویا مجموعۂ استفسار وجواب کی چوتھی جلد ہوگی

۴- سنہ ۲۲ء سے لیکر اس وقت تک جو دلچسپ و مفید معلومات (ادبی، علمی وتاریخی) وقتاً فوقتاً نگار میں شایع ہوئی ہیں انھیں شایع کردیا جائے

۵- سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۴۶ء تک کے بہترین ادبی، علمی، تاریخی وانتقادی مضامین جو اڈیٹر نگار کے قلم سے شایع ہوئے ہیں انکا انتخاب شایع کیا جائے اور ضمیمہ میں ان کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی دیدیا جائے

۶- سنہ ۲۲ء سے لیکر سنہ ۴۶ء تک کے بہترین علمی، تاریخی وادبی مضامین جو دوسرے اہل قلم نے لکھے ہیں، ان کا انتخاب شایع کیا جائے۔

تکلیف تو ہوگی لیکن ایک کارڈ بھیجکر اپنی رائے سے مطلع فرمایئے، کیونکہ قارئین نگار کی رائے معلوم کئے بغیر فیصلہ ہمارے لئے بہت دشوار ہوگا۔

منیجر نگار

ملاحظات

۱۵ اگست اور اس کے بعد

اس میں شک نہیں کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کا دن ہے، کیونکہ یہ دن وہ ہے جب ہندوستان کی آزادی پر پہلا آفتاب طلوع ہوگا، لیکن کیا یہ آفتاب ایسی فضا میں طلوع ہو رہا ہے جو گرد و غبار سے صاف ہے؟ یہ دعویٰ کرنا شاید قبل از وقت ہے۔ ہر چند یہ واقعہ ہے کہ تقسیم ہندوستان کے متعلق جو کشاکش جاری تھی، وہ ایک حد تک ختم ہو چکی ہے اور اصولاً یہ بات طے پا گئی ہے کہ پاکستان کا حصہ ایک علحدہ خود مختار حکومت ہوگا اور نظم و نسق میں ہندوستان سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا، لیکن عملی حیثیت سے ابھی بہت سی گتھیاں سلجھنا ہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سلجھتے سلجھتے کچھ اور نئی گتھیاں پیدا ہو جائیں۔

سب سے پہلا مرحلہ جو ابھی تک پوری طرح طے نہیں ہوا، دونوں حکومتوں کی حد بندی کا ہے، گو سلہٹ اور سرحد کا جھگڑا اب باقی نہیں رہا، کیونکہ دونوں جگہ کی رائے شماری ہو چکی ہے اور کثرت رائے سے یہ دونوں حصے پاکستان میں شامل ہو گئے ہیں، لیکن پنجاب میں لاہور کا مسئلہ ہنوز تصفیہ طلب ہے اور یہ مسئلہ بہت پیچیدہ اور اندیشہ ناک ہے چونکہ یہاں مسلمانوں کی نمایاں اکثریت نہیں ہے، اس لئے وہاں کے ہندوؤں اور خصوصاً سکھوں کی کوشش یہی ہے کہ لاہور پاکستان میں شامل نہ ہونے پائے۔ بہر حال لاہور خواہ پاکستان میں شامل ہو یا ہندوستان میں، دونوں طرح خطرہ میں ہے اور امید نہیں کہ وہاں جلد امن و سکون پیدا ہو سکے۔

دوسرا اہم مسئلہ جس کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا، دونوں حکومتوں کے تعلقات کا ہے اور اگر آثار و علائم کو دیکھ کر حکم لگایا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہونے کی بظاہر بہت کم امید ہے۔ جس وقت سے پاکستان کا قیام متحقق ہو چکا ہے، ہندوؤں کی ذہنیت میں بڑی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور وہ پاکستان کو ایک اجنبی نہیں بلکہ دشمن حکومت سمجھ کر، ان مسلمانوں کے خلاف بھی جو پاکستان میں نہیں رہتے بلکہ خود انھیں کی رعایا ہیں، جذبۂ انتقام کی پرورش کر رہے ہیں۔ پھر اگر یہ جذبہ صرف عوام تک محدود ہوتا تو بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن افسوس ہے کہ صوبہ کی حکومتوں پر بھی اس کا اثر پڑا ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رہی ہیں۔ چنانچہ یوپی میں اس وقت تک دو احکام اس نوعیت کے نافذ ہو چکے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کو چودہ فیصدی سے زیادہ نوکریاں نہ دی جائیں اور دوسرے یہ کہ تمام دفتری و عدالتی کاغذات میں اردو رسم خط کی جگہ ناگری رسم خط کو اختیار کیا جائے اور اگر ہندو مہاسبھا کے دس مطالبات کو یوپی کی حکومت نے تسلیم کر لیا اور گمان غالب یہی ہے کہ

یہ مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے) تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے لئے یہاں کوئی جائے پناہ نہیں ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ یوپی کے مسلمان اصولاً ۱۴ فی صدی سے زیادہ ملازمت کے مستحق ہیں، یا یہ کہ ناگری رسم خط کا رواج کوئی ناجایز بات ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ جذبۂ رواداری سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اگر ہم مہاتما گاندھی اور دیگر اکابر کانگریس کے اقوال کو سامنے رکھیں، جو اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ جلد یا بدیر پاکستان اور ہندوستان پھر ہم آغوش ہو جائیں گے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ صوبہ کی حکومتوں کا یہ طرز عمل غیر دانشمندانہ بھی ہے کیونکہ اس نوع کے سلوک سے دونوں قوموں کے درمیان اختلاف کی خلیج اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کا عبور کرنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا اور پاکستان و ہندوستان کے ایک ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا، ابھی تک پاکستانی حکومت نے اپنے یہاں ہندوؤں کے تناسب ملازمت کے متعلق کوئی اعلان نہیں کیا، لیکن گمان غالب یہی ہے کہ جو تناسب ملازمت وہاں اس وقت پایا جاتا ہے، وہ بدستور قایم رکھا جائے گا اور پاکستانی حکومت اس تنگ نظری سے کام نہ لیگی جو ہندوستان کی بعض صوبائی حکومتوں کی طرف سے ظاہر ہوئی ہے۔

اس وقت اہم ترین سوال جس پر ہندوستان اور پاکستان دونوں کے فلاح و مفاد بلکہ بقائے آزادی کا انحصار ہے، ملک میں قیام امن کا ہے اور یہ مشکل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتی جب تک دونوں قومیں اور دونوں حکومتیں رواداری سے کام نہ لیں اور ماضی کو ہمیشہ کے لئے دفن نہ کر دیں، کیونکہ اب وقت پیچھے مڑ کر دیکھنے کا نہیں، بلکہ آگے قدم بڑھا کر صرف سامنے نگاہ رکھنے کا ہے، لیکن افسوس ہے کہ بعض صوبائی حکومتیں اپنی پالیسی کی بنیاد ماضی ہی کی یاد پر قایم کر رہی ہیں اور اگر بدقسمتی سے پاکستان نے بھی انتقاماً ایسا ہی کیا، تو ہندوستان کا مستقبل بہت خطرہ میں ہے اور کوئی ذی فہم ایسی آزادی کو نہیں سراہ سکتا، جس کی بنیاد ہی بے اعتمادی، خوف، تنگ نظری، انتقام اور کشت و خون پر قایم ہو۔

ہر چند پاکستان کو ایک خود مختار مسلم حکومت کی حیثیت حاصل ہوگی، لیکن ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا مستقبل اس سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ یوپی، سی پی، مدراس، بمبئی، بہار اور مغربی بنگال میں (جہاں غیر مسلم حکومت ہوگی) کروروں کی تعداد میں مسلمان پائے جاتے ہیں اور انھیں پاکستان سے باہر ہی رہ کر جینا مرنا ہے، اس لئے اگر پاکستانی حکومت نے ہندوستان کے ساتھ خوشگوار تعلقات قایم رکھ کر ان کے مفاد کا تحفظ نہیں کیا تو وہ کبھی مستحق مبارکباد نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ چونکہ پاکستانی علاقہ میں ہندوؤں کی کافی آبادی ہے، اس لئے انکے مفاد کے خیال سے ہندوستانی حکومت بھی مسلمانوں سے اچھا سلوک کرنے پر مجبور ہوگی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ پاکستانی علاقہ میں جتنے ہندو آباد ہیں، وہ دولت و سرمایہ داری کی مستقل قوت کے مالک ہیں اور پاکستانی

حکومت اپنے ملک کی خوشحالی بحال رکھنے کے لئے ان کے ساتھ رواداری پر مجبور ہے، لیکن ہندوستانی حکومت میں مسلمانوں کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہے اور پاکستانی حکومت کے ہندوؤں کے مقابلہ میں، اُن کی پوزیشن ہندوستان میں زیادہ نازک ہے۔

بہرحال تقسیم ہند کے بعد جو صورتیں باہمی اختلاف کی پیدا ہوگئی ہیں، وہ خطرہ و اندیشہ سے خالی نہیں اور چونکہ پاکستان نے بہت بڑا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے، اور وہ اس خطرہ کے انسداد کی طرف بھی کوئی فوری توجہ نہیں کر سکتا اسلئے جس حد تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ہندوستان کی تقسیم ان کے لئے بہت زیادہ باعثِ تشویش نظر آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستانی علاقہ کے مسلمانوں میں اس وقت کافی جوش پایا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ بحالاتِ موجودہ ایثار و قربانی سے بھی کام لیں، لیکن چونکہ پاکستانی حکومت کا قیام کسی تدریجی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے اس لئے محض جوش و ایثار سے کام نہیں چل سکتا، بلکہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے حد درجہ تدبر و فراست، حزم و احتیاط بے غرضی و بے نفسی کی ضرورت ہے، اور یہ صفات آج کل کے مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

الغرض ہندوستان یوں تو بظاہر آزاد ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی بھی ایک علٰحدہ حکومت قایم ہو رہی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آزادی ہنوز نامکمل ہے اور ملک ایسے عبوری دور سے گزر رہا ہے کہ جب تک اس کے نتائج ہمارے سامنے نہ آئیں، ہم اسے حصولِ آزادی پر قابلِ مبارکباد قرار نہیں دے سکتے اور اگر بدقسمتی سے اس تقسیم و اختلاف نے خانہ جنگی، ہنگامہ و فساد، کشت و خون کی صورت اختیار کر لی، تو یہ آزادی در اصل ایک لعنت ہوگی، خدا کا قہر ہوگی اور ہندوستان پھر اسی دورِ غلامی کی طرف لوٹ جائے گا اور اس طرح کہ شاید اس سے چھٹکارا پھر کبھی نصیب نہ ہو۔

"نگار" کا جوبلی نمبر جنوری ۴۶ء ہی میں شایع ہو جانا چاہئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ حالات نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی، یہاں تک کہ ۴۷ء میں بھی یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ چند ماہ کے بعد ۴۸ء شروع ہو جائے گا اور اب اس سے زیادہ التوا مناسب نہیں۔ اس لئے اشاعت حاضرہ میں صفحہ اول کے اعلان کو غور سے پڑھئے اور ہم کو مطلع فرمائیے کہ آپ جوبلی نمبر کے لئے کس تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ چونکہ جوبلی نمبر کافی ضخیم ہوگا اور اس کی طیاری اخیر اگست سے شروع ہو جائے گی۔ اس لئے از راہ کرم جلد از جلد اپنی رائے سے مطلع فرمائیے، تاکہ ہم قارئین کی اکثریت کو سامنے رکھ کر کوئی آخری فیصلہ کر سکیں۔

نیاز

تکرارِ تاریخی

۱۔ آج سے کئی ہزار برس پہلے، سرزمینِ وسطِ ایشیاء کے باشندے، معاشی ضرورتوں سے مجبور ہوکر، وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے، لمبے اور دراز قد نوجوانوں اور باوقار بزرگوں کا ایک قافلہ، بچّوں اور عورتوں کی ہمراہی میں چلا، تاکہ معیشت کی ابتدائی آزمائشوں میں کامیاب ٹھہرے، ضرورتوں نے گھر سے جُدا کیا اور معیشت، نے سفر حرکت پر مجبور کیا۔ طویل قد و قامت، فراخ سینوں، روشن چہروں اور چوڑی ہڈیوں والا قافلہ، وسطِ ایشیاء کے میدانوں اور پہاڑوں سے گزرتا ہوا، افغانستان اور ایران پہونچا۔ اور اسی قافلہ کی ایک ٹولی، یونان اور مصر پہونچی، اور دوسرا گروہ پنجاب کے میدانوں میں، بڑھتا بڑھتا آ پہونچا۔

ایک ہی نسل تھی جو مختلف مقاموں پر، مختلف ناموں سے مشہور ہوئی۔ خون اور ہڈّی کی خصوصیات ایک تھیں۔ لہذا اس نسل کے مختلف گروہوں نے تہذیب و شائستگی کی جو جو جنتیں بنائی تھیں، اُن میں اختلاف اور حیرت خیز تنوع کے باوجود وحدت اور یکرنگی بھی تھی! مثلاً ذوقِ جمال کا انداز و نظر سب میں مشترک تھا، لامحدود (Infinite) کو محدود (Finite) کے وسیلوں سے پہچانتے تھے۔ مختلف "خداؤں" کی پرستش سب کرتے تھے۔ حُسن کا تصور، اپنی انتہائی سرحدوں پر جاکر ایک ہوجاتا تھا۔ عورتوں کی گرویدگی اور قدردانی سب میں پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی قدیم آریائی تہذیب۔ ایران میں ژند و پاژند کے آئین و تصورات، یونان میں حکماء کے افکار اور فلسفیوں کے فلسفے اور مصر میں علم الاصنام کی تفصیلات، اس بات کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ حُسن و حق کے تجربوں میں نگاہ و نظر کا انداز بڑی حد تک مشترک تھا۔ ان نسلوں میں، شرافت اور پاکیزگی کے قانون، اصل و روح کے اعتبار سے یکساں تھے۔ اور اُسی روح کے مظاہر مختلف تھے۔ اس اختلاف کا سبب، جغرافیائی عناصر اور معاشرتی تبدیلیوں کے سوا، اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ وسطِ ایشیاء کا یہ نسلی قافلہ، نکلا تو ضرورتوں کے ماتحت، لیکن جب مختلف جغرافیائی خطوں میں پہونچا، تو وہاں کے قدیم باشندوں سے، اُس کو جنگ و جدل کرنا پڑی۔ یہ جنگ، اقتصادی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ اقتصاد و معاش کی یہ کشمکش عرصۂ دراز تک جاری رہی۔ آریا نسل کی قوتوں نے رفاقت کی، ہمت نے ساتھ دیا اور استقلال نے نصرت کا یقین پیدا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریا مختلف خطوں پر غالب آگئے اور اُن کا یہ غلبہ، تہذیب و شائستگی کے ظہور کا سببِ خاص بن گیا۔

۳- ہندستان کے ٹھنڈے ٹھنڈے میدانوں میں، آریوں نے تہذیب و تمدن کے جو آئین مرتب کئے، اُن کی تاریخ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی! — وہ اُس عہد کے افکار کو واضح کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ جنگ و کشمکش سے فراغت پانے کے بعد، تہذیب کن اُصولوں سے آگے بڑھی تھی۔ اور شائستگی کے آئین، کن اُصولوں پر مدون کئے گئے۔

۴- ایران کے آتش کدوں میں جو مناجاتیں پڑھی گئیں، وہ اُس عہد کے دینی رجحانات کو واضح کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ ایرانی آریوں کا ذوقِ جمال، آتشکدوں میں کیا دیکھتا تھا!

۵- یونانی حکیموں کی تعلیم، اُس عہد تمدن کی ذہنی رفعت کا پتہ دیتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ زندگی کو بہتر اور پاکیزہ بنانے کے لئے۔ سقراط و افلاطون کے سامنے کیا کیا مسایل پیش تھے اور اُن کی مضبوط قوتِ متخیلہ کس حد تک تیز اور دوربین تھیں کہ خالص علمی اور فکری مسایل کو بھی، صحت اور آسانی سے وہ اپنی تخیئل میں حل کر لیا کرتے تھے۔

۶- اسی طرح مصر کی قدیم تہذیب، اُس عہد کے مذہبی، ذہنی، معاشری اور فکری رجحانات کو بخوبی واضح کرتی ہے گو ان تہذیبوں کے خارجی مظاہر میں اختلاف ہے لیکن اُن کی باطنی فضا (Internal Atmosphere) ایک ہے! اس فضا میں وحدت ہے۔ سکون اور رفعت ہے۔ فکری انداز میں وحدت کے ساتھ تنوع بھی ہے اور تنوع کی وسعت میں وحدت کی روشنی بھی!۔ ذوقِ جمال میں عموماً پاکیزگی اور رفعت ہے۔ عورت کو دیوی بناتے ہیں اور پھر اُس کو شریک خدائی کر کے سر جھکا دیتے ہیں۔ مذہبی اُصولوں میں اصنام پرستی داخل ہے۔ کیونکہ جملہ آریائی تہذیبیں حُسن کے بے شمار جلووں اور حق کے صدہا مظاہر کو، جُدا جُدا وحدتِ کامل سمجھ کے سر جُھکا دیتی ہیں۔ اسی سے وحدت میں تنوع کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، مسائل زندگانی کی تفہیم میں، عقل اور وجدانی قوتوں کا امتزاج ہے۔ یہ امتزاج (Synthesis) رگ وید و اوپنشدوں، ژند و پاژند کے زیر اثر خیالوں، افلاطون کی جمہوریت (Republic) اور ارسطو کی سیاسیات (Politics) اور مابعد الطبیعیات (meta.physics.) نامی تصانیف میں بخوبی پایا جاتا ہے!

۷- صدیاں گزرتی چلی گئیں، اور یہ تہذیبیں، پھیلتی پھولتی، پھلتی، پروان چڑھتی چلی گئیں۔ اور اُن کے برگ و ثمر کی کثرت و رنگا رنگی نے نگاہوں کو اس طرح مخاطب و متوجہ کر لیا کہ عام نگاہیں، ایک تہذیب کے پروردہ افراد کو، دوسری آریائی تہذیب کے پروردہ افراد سے، بہ آسانی پہچان نہیں سکتی تھیں۔

۸- ایک ہی نسل تھی جو کہستانی زندگی کے سیدھے سادھے اُصولوں کے ساتھ مختلف خطوں میں جا بسی۔ جا بسنے کا سبب، معاشی ضرورتوں کے سوا اور کیا تھا؟ — وہی معاشی ضرورتیں جب متحرک بن گئیں، تو خالق کی وسیع کائنات میں، اس نسل کے افراد، بستے چلے گئے اور پھر رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، ترقی و تہذیب کا عالم، اپنی شانِ نوخیزی اور

جوبن دکھانے لگا!

۹۔ ہر خطّہ کی ایرانی تہذیب، اپنے علاقہ میں، کئی سو سال تک حکمراں رہی اور زمانہ کی ضرورتوں کے دوش بدوش اُس میں تغیرات بھی ہوتے رہے۔ تاریخ کی روح فہمی کے لئے، ان تغیرات کا مطالعہ بھی اشد ضروری ہے۔

۱۰۔ آریائی النسل کی تہذیبیں، رفعت پر پہونچ چکی تھیں اور مالی اطمینان کی وجہ سے مطمئن تھیں کہ یکایک عرب کے ریگستانوں سے، اقتصادی اُمنگوں اور معاشی حوصلوں کا سرگرم کارواں، بادِ صرصر بن کر اُٹھا۔ اور ایران و افغانستان پہونچتے پہونچتے، کالی کالی آندھیاں بن گیا۔ ان ملکوں کے لئے دُنیا کی رنگینی، گویا تیرہ و تار ہو گئی۔ کیونکہ سیاسی اقتدار کے جذبے یہاں قدم جمایا چاہتے تھے۔ عرب اور ایران کی باہمی جنگ، معاشی امنگوں اور اقتصادی حوصلوں کا نتیجہ تھی۔ تاریخ کا ہر ہر چمن اور عرب عساکر کا ایک ایک بیان، جو فتح ایران و ترکی سے متعلق ہے، اس کو بخوبی واضح کرتا ہے کہ کسی انسانی مقصود اعلیٰ کے ماتحت نہیں، بلکہ خالص مادی اور معاشی مسایل کی بنیاد پر یہ جنگ لڑی گئی۔

۱۱۔ وقتی تخیلات کی کوئی معصومیت اس سچائی کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ عرب کے افکار و تخیلات کی اضافی رفعت کے دوش بدوش، ایران، ترکی اور ہند وغیرہ کو تسخیر کرنے کی جو کوششیں کی گئیں، اُن میں معاشی حوصلوں اور جذبوں کو گہرا دخل حاصل تھا۔ ان جذبوں کے دامن میں انسانیت کی وسیع فلاح کی خواہشیں بھی پوشیدہ تھیں۔ انھیں دیگر خواہشوں کی ہمرکابی، عرب کی فتح و نصرت کا ایک خاص سبب بن گئی۔

۱۲۔ عرب کی تہذیب، نسلاً سامی تھی اور اُس کے نسلی رجحانات میں وہ لوچ اور نرمی نہ تھی جس کی موجودگی، مشرقی آریائی نسلوں کو عموماً، ہر تہذیب کے لئے ضروری معلوم ہوتی رہی ہے۔ مشرق کی آریائی نسلوں نے، نرمی اور لوچ کو، تہذیب اور شرافت کا نشان بنایا ہے۔ خاص کر ہند اور ایران میں تہذیب کی روح، یہی لوچ، نرمی اور رواداری تسلیم کی گئی۔ تہذیبِ سامی میں خودسرائی اور خودنمائی کے جذبے، آریوں کے مقابلہ میں زیادہ تھے اور ہیں!۔ کوہستانی آریوں میں، ریگستانی عربوں کی طرح، خود اپنی ذات کی ظاہر آرائی پر زور، یکساں طور پر دیا گیا۔ چنانچہ ان تہذیبوں کا ہر فرد، خود اپنے وجود کو زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود آرایشی کا انداز مختلف ہے لیکن ذوق آرایش یکساں!

۱۳۔ عرب کی سامی النسل تہذیب، مشرق میں مختلف ممالک پر حکمرانی کرتی تھی کہ "روسی" وسطِ ایشیا کے تاتاری مغلوں نے، اقتصادی اور سیاسی رفعت کو اپنی زندگانی کا مسلک و مقصود بنایا اور عرب کی شاندار حکومت پر اس زور شور سے حملے کئے گئے کہ سلطنتِ عربیہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ چنگیز اور ہلاکو، تاتاری عہد کی یادگار ہیں۔ خونریزی اور خون آشامی، جنگ و جدل اور معرکہ آرائیاں، عرب کو مٹا چکی تھیں، لیکن ہند بھی، خوف اور ہراس کے عالم میں رہا۔ معاشی ضرورتیں، تاتاریوں کو متحد کر کے ...... ملکوں کو زیر و زبر کرتی اور تاریخی نقش و نگار کو از سرِ نو بناتی

رہیں۔ خود تاتاری علاقوں میں کبلائی خاں کی حکومت کا شکوہ و جلال، جو مشہور سیاح مارکوپولو (morcopolo) کے بیانات کی معرفت معلوم کیا جاسکتا ہے، تاریخی داستان کی ایک "جدید" کڑی بن گیا۔

۱۴- یہ تاتاری اُسی آریائی نسل کے وطن کی ایک شاخ تھے، جس کا سراغ اولین وسط ایشیا کے کاہستانی علاقوں اور وسیع میدانوں میں معلوم کیا گیا۔ ایک ہی نسلی وطن اور ایک ہی اندازِ زندگانی!۔ ایک ہی جغرافیائی ماحول اور اُسکے اثرات، اور زندگی کی وہی معاشی ضرورتیں جن کے نتیجہ میں جہد و سعی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اور بقائے حیات کے لئے کاوش پیہم جاری رہی!

۱۵- تاتاریوں کی اخلاقی بدقوارگی کو، جس نے تراشا، اور سنوارا، وہ قرآن کی تہذیب تھی! قرآن کی تہذیب، توحید کے تصور اور رسالت کے اقرار پر مبنی تھی اور یہ سب اس لئے کہ خود روحِ انسانی تسکین پائے، اور پھر تمدن پر، اپنی روحانی یقین کا نقش چھوڑے اور زندگی، محمدؐ کے اسوۂ حسنہ سے سنورتی چلی جائے۔ قرآن ہی کی تہذیب تھی جسنے چنگیز کی خون آشامی کو کم کیا اور پھر تاتاری، خون آشام ہونے کے باوصف، تیمور کی خون آشامی سے بیزار ہوگئے چنگیزیت کو تاتاریوں میں، جس نے کم کیا اور تیموریت کی شکل پر قناعت کی، وہ اسلام تھا۔ بعدہ، آل تیمور کو ایران کی شائستگی نے سنوارا۔ اور اُس کے معنوی جوہر اخلاق کو اُبھارا۔ بابر، ہمایوں اور اکبر پر ایرانی تہذیب کے اثرات تھے یہ اثرات، ابوالفضل و فیضی کے اثر سے اس درجہ پختہ ہوگئے کہ ہند کی مغلیہ تہذیب، ایرانی تہذیب کا نقشِ جدید بن گئی رفتہ رفتہ ہندی مغلیہ تہذیب کے مذاق کے زیر اثر ہندوستان میں ایک ایسی تہذیب کی داغ بیل پڑگئی جو کئی طرح کے رنگ و روغن سے مرکب تھی!۔ آریائی نسل کا لطیف و وسیع ذوقِ جمال، فنونِ لطیفہ کی قدر دانی، عورت کا معاشرت میں نسبتاً بلند تر مقام، فکر و علم کا ذوق، حق کا وجدانی تصور ــــــــــ قلب میں ایمانی لچک کا پیدا ہو جانا اور سامی تہذیب کی ورثہ میں پائی ہوئی سختی اور سخت گیری کا تغیر پذیر امتزاج، رزم کے حوصلے اور بزم کے ایرانی سلیقے، اور انفرادی طور سے، لطف و کرم کی وہ بارش، جو دوسروں کے لئے رحمت و برکت بن جائے۔ لیکن جاگیرداری نظام کے ماتحت، انسانی وجود کی عظمت کا کم ہو جانا اور طبقاتی حد بندیوں کی شدت کا اُبھرنا وغیرہ وغیرہ یہ ایسی خصوصیتیں تھیں جو ایران و ہند کی تہذیب کے اشتراک سے ظہور میں آئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، ان مغلوں نے سامی خصوصیاتِ تہذیب کو بھی اپنے میں جذب کرلیا تھا۔ یعنی توحید کا خالص اسلامی عقیدہ، رسالتِ محمدیؐ کا اقرار، تحفظِ ذات کے لئے، ہر ممکن جسمانی و معاشی کوشش، اور غیرت و خودداری کا وہ تخیل، جو عرب کا نشانِ امتیاز ہے!

۱۶- مغلوں کی یہ تہذیب اُس وقت جگمگائی، جب ایران میں ایرانیت کا شباب تھا اور شاہان صفوی وہاں حکمرانی کرتے تھے۔ ہند اور ایران سے بہت دور، انگلستان میں ملکہ الزبتھ (Elizabeth) حکومت کرتی تھی۔

وہاں بری امن اور بحری ترقی، دیکھنے کی چیز تھی۔ کیونکہ انگلستان کا مختصر جزیرہ، بری امن سے ترقی کرتا ہوا، بری فتح مندیوں کی طرف آگے بڑھا۔ اور رفتہ رفتہ اسی بری قوت سے مشرق پر بھی چھا گیا۔ تاریخ کا یہ دور عام تہذیب اور شائستگی کا عہد تھا۔ تمدن کے آئین اس انداز سے مدون ہوتے چلے گئے کہ جیسے کسی ہنرمند نے تمدنی اہرام بنائے ہوں۔ کہ مضبوطی اور پختگی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یا کسی صاحب کمال نے ان میں وہ حسن و ترتیب پوشیدہ کر دی ہو، جو تاج محل کے باکمال نے اپنے تخلیقی سنگی میں پوشیدہ کر دی ہے۔ ہند میں مغلیہ تمدن، اشرافیہ طبقہ کے ذوق و جمال اور مذاقِ زندگانی کا نمونہ تھا۔ لہٰذا جب اس طبقہ میں سیاسی ضعف پیدا ہو، تو اس تمدن کی طنابیں گھٹنے، بڑھنے اور بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہی سبب ہے کہ اٹھارویں صدی میں، اُس کی قوتِ حیات میں کمزوری پیدا ہوئی۔ جو برابر بڑھتی چلی گئی۔ ہند کے برخلاف، انگلستان کی آریائی نسلوں نے، تمدن میں انسان کو جو عزت دے رکھی تھی، وہ اُس کے کام آئی۔ قوم کے افراد، زیادہ آسانی سے ملک کی خدمت میں لگے ہوئے تھے یوروپ کی آریائی نسلوں کے متعدد قافلے، بحری قوت سے مشرق میں اپنے قیام و استحکام کی تدابیر کرنے لگے اور ان تدابیر کی غرض اولین، معاشی محرکات تھے۔

۱۷۔ یوروپ نے اپنی نئی نسلوں کو جدید علوم کی بنیادوں پر توانا کیا تھا۔ جدید علوم کی اشاعت میں، کلیسا نے دامنِ ترقی پکڑ لیا تھا۔ لیکن قوم کی خود اعتمادی اور افرادِ علمی کی خود آرائی کام آگئی۔ وہ بغاوت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ کامیابی ہوئی اور عقلی نگاہ کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی۔ جب ہند اور ایران میں داخلی نگاہ کی تربیت و پرداخت، ہندی و ایرانی تعلیم کا مقصد تھا۔ تو یوروپ کے بعض ترقی پرور ملکوں میں، جن میں انگلستان اور فرانس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، نگاہ کو مشاہدہ اور خارجی اندازِ نظر کی تربیت میں باکمال بنانے کی سعی کر رہے تھے۔ جس طرح یونان کو اپنی فلسفیانہ نگاہ سے قوت ملی تھی۔ عرب کو علمی نگاہ اور عسکری اندازِ زندگی سے فائدہ ہوا تھا، ایران کو وجدان سے سکون ملا تھا۔ ہند کو امتزاج و تعاون سے خوشی حاصل ہوئی تھی، اسی طرح انگلستان کو، استقرائی منطق (Induction Logic.) اور فرانس کو عمرانی تفکر (Sociological Thinking) سے نئی قوت اور نئی زندگی ملی۔ انگلستان کے بیکن (Bacon) نے استقرائی منطق میں بڑا کمال دکھایا۔ پھر جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) ہکسلے (Huxley) اور اسپنسر (Spencer) ہیوم اور لاک (Hume and Locke) سے تمدن کے علمی مزاج (academic nature) میں نئی بیداریاں پیدا ہوگئیں اسی طرح فرانس میں عمرانی علوم کو نئے سرے سے سنوارا گیا۔ جس میں روسو کی معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کو گہرا اور وسیع دخل ہے۔ مغربی علوم سے تمدن میں جو بیداریاں پیدا ہوئیں وہ خود انگلستان اور فرانس کی سیاسی و معاشی زندگی میں انقلابات لائیں۔ افراد کے حوصلے بڑھاتے رہیں اور سوسائٹی کو نئے ولولے دیتے رہیں! انگلستان و فرانس

کے انقلابات سے یوروپ کے کئی ملکوں اور امریکہ کی کئی ریاستوں نے، فایدے اُٹھائے اور خود اپنی تہذیب میں جدید علوم اور جدید علمی نگاہ کو روحِ زندگانی سمجھ کے داخل کرلیا۔ جو سوسائٹی علوم کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اس کا غلبہ یقینی ہے اور یہ غلبہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ سیاسی حکومت اور معاشی فوقیت کے ختم ہوجانے کے بعد بھی، اُس سوسائٹی کے نقش و نگار باقی رہتے ہیں۔ ہند کے قدیم روحانی علوم کا غلبہ، ہند پر آج تک ہے۔ تلک، ٹیگور، گاندھی، اروندو گھوش، بھگوان داس سب قدیم علوم سے متاثر ہیں۔ حالانکہ آریائی ہندی حکومتیں ختم ہوچکیں، یونان کی قدیم تہذیب، علوم کا گراں قدر سرمایہ فکر و نظر کے لئے چھوڑ گئی۔ روما، مصر، عربستان، ایران، ہند اور خود یوروپ، اُن کے زیر اثر ہیں اسی طرح انگلستان اور فرانس کی علمی کھیتوں سے فیض یوروپ اور امریکہ نے بھی حاصل کیا۔ اور رفتہ رفتہ مشرق نے بھی۔ آج مشرق کے علمی دماغوں پر یوروپ اور امریکہ کے علوم کا گہرا اور وسیع اثر ہے اسی اثر نے ایک دوسرے کو قریب کر رکھا ہے۔ اور عالمگیر علمی برادری کو آفاقی انداز و نظر پر ایک وحدت بنانے کا خاموش ساعی ہے!

۱۸- جب یوروپ کے تمدن پر علمی جوبن آرہا تھا، تو ہند و ایران کی جاگیرداری معاشرت کی قوتِ حیات، رفتہ رفتہ گھٹ رہی تھی۔ ادھر یوروپ کا سرمایہ داری نظام، صنعتی شکلوں میں ترقی کر رہا تھا۔ بحری قوت، حوصلوں کو بڑھا رہی تھی۔ ہند میں حیدر علی والیِ میسور مجبور ہو کے یہ کہہ رہا تھا کہ انگریزوں کو تو میں ہندوستان سے نکال سکتا ہوں لیکن سمندروں کو تو خشک نہیں کر سکتا۔ ہند کا سرمایہ صنعتی شکل یوں نہ اختیار کر سکا کہ جدید علوم سے آگاہ نہ تھا۔ اُس کی علمی نگاہ، خود وجودِ انسانی میں غلطاں رہی۔ کائنات کا تجربہ اور حیات کا علمی جایزہ، ہند و ایران نہ کر سکا۔ یہی سبب ہے کہ یوروپ کی جدید تہذیب العلوم کی ہم رکابی میں آگے بڑھ گئی۔ اُس نے صنعتی کاموں کو ہند و مشرق میں پھیلا کے، اپنے لئے معاشی غلبہ کی تخم ریزی شروع کردی، جب فصل پر کھیتیاں کٹنے لگیں تو مشرق کی آنکھیں کھلیں!۔ اس تہذیب نے زوال پذیر معاشرت پر سیاسی اور معاشی ضعف کے باعث قبضہ کرلیا۔ جدید علوم نے اُس کو بخوبی اسلحہ بند کیا تھا۔ اس تسلط میں بھی اقتصادی حوصلے کام کرتے رہے۔ اور معاشی اُمنگیں اپنا جوشِ عمل دکھاتی رہیں۔ کلائیو سے ڈلہوزی تک یہی سلسلۂ حوصلہ و نصرت جاری رہا۔ پرتگالی اور فرانسیسی تاجروں نے بھی غلبہ کی غیر معمولی کوششیں کیں اور جہاں ممکن ہوسکا، قوت حاصل کی۔ معاشی اُمنگوں کے نغمے سب حاصل کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ مختلف خطوں پر، مختلف مغربی قوتوں کا کامل طور سے، سیاسی تسلط بھی ہوگیا۔ کہیں برطانوی قوت کو غلبہ ملا، اور کہیں فرانس اور پرتگال کو۔ اور ان سب کی فتح مندی کی پشت پر مغربی تہذیب اور جدید علوم کی قوت تھی اور خود ان اُمنگوں کے دامن میں وہی تکرارِ تاریخی!۔۔ یعنی معاشی اُمنگوں کا ظہورِ منظم اور اُس کی وسعت و حکمرانی!۔ کبھی معاشی ضرورتیں وسطِ ایشیا کے آریوں کو، حرکت و غلبہ کے کامیاب سبق دے رہی تھیں اور کبھی انگلستان و فرانس، مشرق کو معاشی غلبہ کے لئے تاراج کر رہے تھے! ایک ہی قانون ہے، جو معیشت کے دامن میں، تاریخی حرکت و ارتقا پیدا کرتا رہا ہے

زندگی اور کائنات کا یہ قانونِ حرکت، سب سے پہلے ہیگل (Hegel) کو متصوفانہ طور سے محسوس ہوا۔ اور اُس نے اپنی مشہور تصنیف "فلسفۂ تاریخ" میں (Philosophy of History) اُس کو بخوبی نمایاں کیا۔ اسی فلسفہ کے اثر سے، زندگی کا وہ جدلی فلسفہ ظہور میں آیا۔ جس نے کائنات اور زندگی کو سمجھنے کا طریقہ ہی بدل دیا۔ میری مراد، کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت و اشتمالیت سے ہے، جو خود یوروپ کی سرمایہ پرور تہذیب کے خلاف، ایک عاقلانہ و تاریخی ضربِ کلیم کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۔ جب یوروپ میں سرمایہ داری نظام، انتہائی بلندیوں پر تھا، تو کارل مارکس لاطبقاتی معاشرہ کے قیام کی دعوت دے رہا تھا۔ تاکہ کل نوعِ انسانی، مالی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حیثیت سے ترقی کر سکے۔ ادھر مشرق میں یوروپی تہذیب کے اثر سے، ۱۹ ویں صدی کے آخر تک، مشرق اور مغرب ایک ہوتا چلا گیا۔ یہ قربت اور وحدت، صرف اس اعتبار سے تھی کہ معاشی اور سیاسی اقتدار نے مشرق کے اکثر ملکوں کو، مغرب کے زیر اثر کر دیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت اور ذکر کے لایق ہمارا ہندوستان ہے جو ہزار ہا سالہ قدیم تمدن کے پہلو بہ پہلو، مسلم ہندی معاشرت اور مغلیہ ہندی کلچر کے اثرات کو بھی اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

۲۰۔ عین اُس زمانہ میں جبکہ مغربی صنعتی سرمایہ داری نظام نے ترقی کرتے کرتے، شاندار شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لی تھی، لبطن یوروپ سے ایک فلسفی اُبھرا، جس نے زندگی اور معاشرہ کا ایسا تصور پیش کیا۔ جو روسی نظام کو درہم برہم کرنے والا تھا۔ اس فلسفی کے پیام اور تصورِ زندگانی کو، جس ملک نے سب سے گہرے طور پر قبول کیا، وہ یہی روس کی سرزمین ہے۔ وہ یہی روس ہے، جس نے کبھی وسطِ ایشیا سے آریائی نسل کے قافلوں کو، معاشی ضرورتوں کے ماتحت حرکت کا عملی پیام دیا تھا اور جو رفتہ رفتہ مشرق و مغرب میں پھیل گئے۔ ہند، ایران، یونان، فرانس تک اُن کی نسلیں پھیلیں خود اُن کی معاشرتی اور اقتصادی ضرورتیں، اُن کو حصولِ غلبہ و اقتدار کا درس دیتی رہیں۔ قوم حیات پرور تھی، عمل کر کے غلبہ میں کامیاب ہوتی رہی، پھر اسلام کے پیام کو، تیمور و بابر نے قبول کرنے کے باوصف، اسلام کے امن پرور اصولوں میں تغیرات بھی کئے۔ کیونکہ خود اُن کی معاشی ضرورتیں، سیاسی غلبہ اور اقتصادی تاراجی کو ضروری بتا چکی تھیں۔ اسی طرح مغربی آریوں نے بھی، مشرق کو سرمایہ داری نظام کے ذریعہ سے، مغلوب و محکوم بنانے میں، کوئی کمی نہیں کی۔ کیونکہ خود اُنکی معاشی ضرورتیں، تاراجی کو قومی فتحمندی کا کاذب لباس دے چکی تھیں۔ اب پھر روس نے کارل مارکس کے پیام کو قبول کر کے "تکرارِ تاریخی" (Historic Repitition) کا مزید ثبوت، خود ہی فراہم کر دیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جو انقلاب ہوا، اُس نے روس کی زندگی ہی بدل دی اور حیات کا ایک نیا جاں بخش تصور پیش کیا۔ اس تصور کے چند اجزاء یہ ہیں :۔

۱۔ انسانیت کی تاریخ، طبقاتی جنگ و کشمکش کی تاریخ ہے۔

۲۔ کائنات کی علمی تعبیر و ترجمانی، صرف مادی وسایل اور ذرایع پیداوار ہی کو پیشِ نظر رکھ کے کی جاسکتی ہے۔

۳۔ انسانیت کی فلاح کے لئے طبقاتی کشمکش کو ختم کرنا چاہیئے اور اُس کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ معاشرت و تمدن میں طبقات کا وجود ہی ختم ہوجائے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ انفرادی و شخصی ملکیت ختم کی جائے۔

۴۔ مملکت کی ملکیت کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کردیا جائے۔ تاکہ اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی اور عادلانہ ربط پیدا ہوسکے!

۵۔ تمدن جب تک لاطبقاتی نہ ہوجائے، ایک محکم پرولیتاری آمریت کا قیام ضروری ہے تاکہ اجتماعی زندگی میں فوری عدل قایم کیا جاسکے!

بلاشبہ، روسی دل و دماغ، حقیقت پسندی (Realism) کی طرف زیادہ مایل ہیں، واقعات کی سختیوں کے روبرو، حقایق کی لطافتوں کی طرف، وہ مایل کم ہوتے ہیں اُن کی زندگی جہد و مقابلہ کی زندگی ہے۔ جغرافیائی حالات کچھ ایسے ہی ہیں۔ میدانوں کی خنکی اور دریاؤں کی یخ، اُن کو عمل کے لئے متحرک کرتی رہتی ہے۔ وہ زندگی کے مسلسل مقابلوں کے روبرو انوارِ زندگانی کی جانب مائل ہی کیوں کر ہوسکتے ہیں!

۲۱۔ سچ یہ ہے کہ روس میں نورِ زندگانی کا تخیل ہی دوسرا ہے۔ نان و نمک کی فراغت سے جو سکون پیدا ہوتا ہے وہی اُن کے لئے بہت کچھ ہے، اُس کے بعد وہ زندگانی کی اعلیٰ قدروں کی طرف مایل ہوتے ہیں، اُن کو اس خیال پر پورا یقین ہے کہ معاشی مسایل ہی زندگی کا اصل راز ہیں اور اُن کے دامن میں تہذیب و تمدن کے سانچے بنتے، بگڑتے سنورتے اور نکھرتے رہتے ہیں۔

۲۲۔ روسی کچھ اور دیکھیں یا نہ دیکھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اُن میں دیکھنے اور سمجھنے کی قوت شدید ہے۔ وہ زیادہ تر وہی چیزیں دیکھتے ہیں جو دیکھی جاسکتی ہیں۔ اُن کی توجہ اُن باتوں کی طرف ہمیشہ زیادہ رہتی ہے جو ٹھوس اور ارضی حقایق ہیں اور جن میں مادی زندگی کے فلاح کے حقیقی راز مضمر ہیں۔ اپنے مخصوص سیاسی و معاشی حالات سے متاثر ہوکر اور اقتصادی حاجتوں سے مجبور ہوکے، وہ کبھی کبھی اُن سچائیوں کو بھی فراموش کردیتے ہیں جو کئی سو سال سے اُن کا ذہنی اور فکری سرمایہ ہیں۔

۲۳۔ زندگانی کا یہ ٹھوس مادی تصور، سرزمین روس کی آب و گل کی جغرافی خصوصیت ہے، سربفلک برف پوش پہاڑوں کی خنکی، میدانوں کی سخت گیری، ارض و سماکی سنگلاخ فضا۔ دھرتی میں انسان کا مقام عظمت، سب مل جل کے خاموش ہدایت کرتے ہیں کہ انسان ہی زمین کا مالک ہے اور اس زمین میں مادی ذرایع پر قبضہ فلاح کا ذریعہ ہے، روس کے باشندوں کی نسلی جنگ جوئی اور مادی کشمکش کی داستانیں بھی مل جل کے ایک ہی خیال کو قوت دیتی رہتی ہیں۔

۲۴- نہ صرف روس بلکہ علاقۂ وسط ایشیا کے باشندوں میں معاشی حصولِ فلاح کے رجحانات، زندگی کے قوی ترین محرکِ عمل بن جاتے ہیں اور ان رجحانات کی شدت اُن کے اخلاقی گل بوٹوں کو اکثر کھلاتی رہی ہے۔ اُن کی تاریخوں کے تمام اہم معرکے، معاشی سوالات ہی سے ہمیشہ پیدا ہوئے، حتیٰ کہ مذہبی معرکہ آرائیوں میں بھی، معاشی ترقی اور غلبہ کے مقاصد کارفرما رہے ہیں۔ تاتاریوں کے حملے اور بغداد کی بربادیاں، ترکوں کا عروج اور سیاسی غلبہ، افغانوں کی کشورکشائیاں اور ہندی لوٹ مار، مندروں پر حملے اور دولت پر قبضے، تیمور کا عروج اور اقدامی خوں آشامیاں، بابر کا عروج اور ہندوستان پر سیاسی اقتدار۔ ان سب کے دامن میں معاشی غلبہ کے مقاصد کارفرما ہیں اور انھیں مقاصد نے غالب و حکمراں ہو جانے کے لئے، طرح طرح کے وسایل سے مدد لی گئی۔ جب انسانیت کی تاریخ ہی سیاسی اور خاص کر معاشی مقاصد و محرکات سے بنتی چلی گئی ہو، تو کارل مارکس اور اُن کے شارحین فلسفہ و حکمت کی نظر میں، زندگی اور تاریخ کو حکیمانہ طور سے جانچنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ معاشی اور اقتصادی مسائل کو سمجھا جائے۔ اُن کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے، عمرانی اور سیاسی، تمدنی اور تہذیبی مسائل کا جایزہ بھی ضروری ہے۔ روسیوں نے اس راز کو سمجھ کے نئی قوت حاصل کی ہے اور ایک نئے تہذیب و معاشرہ کی داغ بیل ڈالی ہے۔ موجودہ روس کے معاشی تصورات، مربوط ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ انسانی معاشرہ کی موجودہ دقتوں کا ایک مربوط علمی نسخہ بن چکے ہیں۔ روس میں جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، وہ صاحب سرمایہ کارل مارکس کی تمناؤں کا کلیتاً آئینہ دار تو نہیں ہے۔ لیکن اس کا مدعی ضرور ہے کہ کارل مارکس کا تصور معاشرہ ہماری قومی زندگی کا خاص مقصد ہے۔ مارکس کے افکار نے سورج بن کے دور دور اپنی کرنیں ڈالی ہیں۔ انگلستان میں فیبی ائی اشتراکیت (Fabian Socialism) اور "تکثیریت" (Pluralism) یا یوروپ میں (Guild Social-ism) اور "قومی اشتراکیت" (National Socialism) یا اشتراکیت کے سایہ میں زندگی کے بعض اہم مسایل کا حل تلاش کرنے کے مدعی ہیں۔ مارکس نے جس خیال کو فروغ دیا تھا، اُس کی شعاعیں دور دور تک جذب کی جا چکی ہیں۔ اٹلی اور پھر جرمنی نے اشتراکیت کے اُصولوں کو جذب کیا لیکن پھر اپنی نسلی و ملکی خصوصیات کے اثر سے، روس کو فسطائیت کی نئی شکل دی۔ دونوں کا مخالفانہ تصادم ہوا۔ اشتراکیت ہی غالب آئی۔ اور اب اُس کا غلبہ روس کی حدوں سے گزر کر، انگلستان اور ہندوستان، آذربائی جان اور امریکہ تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

۲۵- مارکس کے خیالات کا یہ اثر ہے، کہ زمانۂ حاضر کی جملہ عالمگیر تحریکیں، انسانیت کی فلاحِ عام کے جذبوں کا سہارا لے کر اُٹھ رہی ہیں۔ فلاحِ انسانیت کو مدارِ سیاست دخل بنانے کا تخیل مربوط طور سے کارل مارکس ہی نے پیش کیا تھا یا کارل مارکس سے قبل مورس اور اوون (Morris and Owen) نے جذباتِ فلاح کو، اخلاقی اشتراکیت کے سند روپ میں پیش کر چکے تھے۔ انسانیت کی فلاح اور خدمتِ نوعِ انسانی کے نام سے طبقوں کی خود غرضیاں بھی،

خارجی لباس وہی اختیار کرتی ہیں جو عام لوگوں کو اشتراکیانہ ہمدردیوں کی خبر دیں۔ ہندوستان کا قدامت نواز ملک بھی انسانیت کی معاشرتی فلاح کے لئے بیسویں صدی سے کوشاں ہے۔ اس ذوق میں ۱۹ ویں صدی کے مارکسی افکار کو پیشوائی کا اعزاز حاصل ہے۔ مثلاً مارکس نے عالمگیر اصولوں پر انسانیت کو سکھ اور خوشی کی تعمیری راہ دکھائی، ہند میں ٹیگور کے گیتوں میں عالمگیر انسانیت کے احساسات، شعری صناعیوں کی بدولت پھول بن بن گئے ہیں۔ گاندھی پر گیتا کے ساتھ ٹالسٹائی کا اثر ہے۔ اقبال بھی صاحب سرمایہ سے متاثر ہیں۔ اُن پر منفیانہ اثر ہے جیسے اشتراکیت کے اثرات، اٹلی اور جرمنی میں منفیانہ شکل میں ظاہر ہوئے! یہ منفیانہ اثرات اس لئے اور زیادہ ہیں کہ اقبال، ماضی کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔ اور اُن کو اُمتِ مسلمہ کی اخلاقی کمزوریاں اور اقتصادی دشواریاں، فکر و نظر کے بھنور میں ڈالتی اور اُبھارتی، اُچھالتی رہی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی فکر و نظر کو ثبات و قرار نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ:

گرمادٔ غلاموں کا لہو، سوزِ یقیں سے کنجشک فرو مایا کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ، کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب روس میں سلطانیِ جمہور کا زمانہ جلوہ گر بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن جب اس الہام کے کوئی دس بارہ برس بعد سلطانیِ جمہور کا زمانہ جلوہ گر ہو گیا، تو اقبال اُلٹے پاؤں پلٹ گئے اور لگے یہ کہنے:۔

اے طائرِ لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی! پرواز میں آتی ہے جس رزق سے کوتاہی!

بات یہ بھی صحیح ہے۔ اُس رزق سے موت ضرور اچھی ہے، جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آجائے! ۔ افلاس بھی تو پرواز کی قوت ضعیف کرتا ہے۔ افلاس معاشی نظم کی غلطی اور ظلم سے پیدا ہو گیا ہے، اس ظلم کو ختم کرنا ضروری ہے تاکہ اطمینان کی فضا پیدا ہو اور انسان، حیوان کی جگہ طائرِ لاہوتی بنے۔ طائرِ لاہوتی بننے کے لئے معاشرہ میں عدل کی ضرورت ہے۔ اس عدل کو حاصل کرنے کی کیا صورت ہونا چاہئے؟ یہاں اقبال خاموش ہیں ---------- لیکن پھر چونکہ وہ فسطائیت کے فوری انگیخش سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لئے مسولینی اور نپولین کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی ذہنی رفتار فسطائی ہے۔ محکوم ہند کی فضا میں اس کے آثار پوری طرح نمایاں نہ ہو سکے، ورنہ معلوم ہوتا کہ مارکس کو کلیم بے تجلی کہنے والا، اقبال، ہیگل کے کلیت پرور تصورِ مملکت سے کس درجہ متاثر ہے تاہم اس میں کلام نہیں کہ وہ مارکس کی تعلیم سے منفیانہ طور سے متاثر ہے۔

اقبال کے برخلاف، ٹیگور نے جو خیالی جنت بنائی ہے۔ وہ فسطائی تشدد سے دور ہے، وہاں پھول ہی پھول ہیں بعض حضرات کو اُن کے کلام میں نسوانیت نظر آتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ آدمیت کا منتہا "نازک مردانگی" ہے۔ مرد وہی بہتر ہے جس میں نسوانی حسن و لچک ہو اور عورت وہی بہتر ہے جس میں مردانہ قوت فیصلہ اور عزمِ صادق ہے۔ شخصیت

کی اسی تکمیل کے لئے باری تعالیٰ نے مرد و عورت کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی اور زوجیت کے اُصول کو حیات کا محکم و عالمگیر قانون بنا دیا۔ اس تصور کی روشنی میں، ٹیگور نے جو جنت بسائی ہے۔ دونوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ عورت و مرد کے لئے بھی، اور مشرق و مغرب کے لئے بھی! — وہ صرف خیالی اور شعری جنت کا ناظم حکیمانہ تھا اُس میں اقدام کی قوت نہ تھی۔ یہ اقدامی قوت، گاندھی میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ گاندھی کا پیام ہند کے مخصوص حالاتِ تمدن کا نتیجہ ہے۔ وہ معاشرتی و عمرانی مسایل کے دامن میں حق پرستی اور عدم تشدد کے اُصولوں کو دین کے طور پر، دلوں میں مرتسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں آج ہند جس دور سے گزر رہا ہے اُس میں گاندھی کا پیام، سرمایہ داری کا حامل معلوم ہوتا ہے، شاید ایسا ہی ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اشتراکیت کا دشمن نہیں ہے۔ اُس نے اشتراکی تعلیم کو اخلاقی اور روحانی راہوں سے جذب کیا ہے۔ اسی لئے وہ ہند میں ایک جدید اشتراکی تصور کے طور پر، ابھی عالم طفلی میں ہے۔ نتائج کا انتظار کرنا ہوگا تاکہ صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ تاہم اسمیں کوئی شک نہیں کہ نوع انسانی کا جو درد، اُووَن اور موریَسن نے اشتراکی رنگ میں محسوس کیا تھا۔ اور جس کی اخلاقی مثالیں ہر رنگ میں پائی جاتی ہیں، وہ بہترین تمدنی تحریک کی شکل میں، گاندھی کے ذہن و عمل سے ظاہر ہوئی ہیں۔ اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کو، انسانیت کی عام فلاح کے لئے کام میں لانے کے لئے عوامی محاذ کو قایم کرنا ضروری ہے۔ عوامی محاذ گاندھی کی نظر میں حق پرستی اور عدم تشدد کی روشنی میں ہونا چاہئے۔

کتاب سرمایہ (Capital) کی مختصر تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اب ایک اُبھرتا ہوا سورج بن چکی ہے۔ پہلے ہلال کی طرح رونما ہوئی، پھر بدر کامل بنی۔ لیکن اب اُس میں حرارت پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ محض فکر و نظر کی کتاب نہیں رہی۔ چمکتے ہوئے سورج کی طرح اُس کی کرنیں اور اُس کی فکر و نظر کا فیض، دُور دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کتاب کی تعلیمی فیض بخشی سے روس نے ۱۶ کرور انسانوں کو غموں اور بے چینیوں سے معاشی نجات بخشی ہے اور حکومت کے دل پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ سب باتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ:-

(۱) انسانیت جن معاشی دشواریوں میں اسیر ہے، اُن کا حل سرمایہ ہی سب سے بہترین طور سے پیش کرتی رہی ہے جس کی وجہ سے مختلف ملکوں نے سرمایہ کو ہادی بنایا ہے یا روس کی کامیابی سے اشتراکیت کے اثرات کو قبول کیا ہے (۲) سرمایہ کے افکار، تہذیبی اور عمرانی نظر کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور معاشی عدل سے کائنات میں ہم آہنگی اور زندگی میں شگفتگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ کی علمی فوقیت اور روس کی علمی مثال کیا عجب ہے کہ دوسرے ملکوں کو بھی حالات مخصوص کی نوعیت کے ساتھ ساتھ عدل و سکون بخشے۔ (۳) اگر ایسا ہوا تو گویا تاریخ پھر اُس واقعہ کو ایک جدید شکل میں دوہرائے گی، جس کی تاریخ، بہت طویل، وسیع اور باعظمت ہے! — یہی کہ وسط ایشیا سے آریائی قافلے چلے اور مختلف ملکوں میں پہونچ کے مختلف قسم و طرز کے تمدنی مرکز اور تہذیبی حلقے بتاتے گئے! — یا پھر

مغل اور تاتاری اُبھرے اور ہندوستان، تاترکستان ذہنی تہذیب کے کئی نقشے جمائے، جو جمے اور اُکھڑے! ۔ اب وسط ایشیا ہی کی ایک حکومت، روس کا سیاسی و تمدنی حلقہ ہے۔ جو اپنے فکری بل بوتے پر حکمرانِ عالم ہوجانا چاہتا ہے۔ روسی حکومت نے اقوام کے ذوقِ آزادی کو سیاسی اور معاشی طور سے محفوظ رکھنے کی کوششوں کے پہلو بہ پہلو نظم و اتحاد کی جو راہ نکالی ہے، وہ متعدد ملکوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے لاکھوں انسانوں کے لئے روسی نظم سیاسی ایڈیل کا چراغ ہے۔ تاکہ آدمیت اقتصادی اور معاشی مجبوریوں سے نجات پائے اور معاشرتی راحتوں کے حصول میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوسکے!

۲۶۔ تاریخی مشیت کا اندازِ رفتار دیکھو کل کے آریا، جسمانی بل بوتے پر لڑتے اور فتح پاتے چلے گئے اور آج کے آریائی روسی، فکر و نظر کے بل بوتے پر، سرمایۂ عالم سے آمادۂ جنگ ہیں۔ یہ جنگ فکری اور ذہنی راہوں میں ہے، تبلیغ و حکمت کا عمل جاری ہے اور یہ اس لئے کہ جمہوریت حقیقی ۔ یعنی معاشی اور معاشرتی جمہوریت کا تصور اشتراکی، عملی شکل میں عام ہوجائے اور حکومت پر عدل کامل کا غلبہ ہوتا کہ لاطبقاتی سوسائٹی قایم ہو۔ اور وہاں اقتصادی اور معاشرتی عدل ابدی سچائی بن کے، حیاتِ انسانی کو منور کردے!

ولی کمال خاں ۔ ایم' اے

فراقؔ گورکھپوری کی کتابوں کا پورا سیٹ

۱۔ رُوپ (جمالیاتی رباعیاں) اشاعت کے پہلے ہی طوفانی طور پر مشہور ہوچکی ہیں۔ یہ پورا مجموعہ کام روپ کا جادو ہے۔ جمالیاتی شاعری سولہ سنگار کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ پانچ قیمتی رنگین تصویروں کے ساتھ۔ فی جلد پانچ روپئے آٹھ آنہ۔

۲۔ **شبنمستان** ۔ فراقؔ کی وہ شاہکارانہ غزلیں جو ہمیں کائنات کا احترام کرنا سکھاتی ہے اور ہمیں خود اپنی عظمت کا احساس کراتی ہے۔ ۵۱۲ صفحات ۔ بہت قیمتی کاغذ اور جلد ۔ فی جلد چھ روپے۔

۳۔ رمز و کنایات ۔ فراقؔ کی وہ غزلیں جو شبنمستان میں شامل نہیں ہیں۔ ۲۴۰ صفحات ۔ فی جلد تین روپیہ آٹھ آنہ۔

۴۔ روحِ کائنات ۔ فراقؔ کی پرعظمت نظموں کا مجموعہ ۔ اب کمیاب ہے۔ فی جلد چار روپیہ آٹھ آنہ۔

۵۔ اُردو کی عشقیہ شاعری ۔ اس موضوع پر فراقؔ نے اس کتاب میں ہر قدم پر چونکا دینے والی بحث کی ہے۔ اب کمیاب ہے۔ فی جلد دو روپیہ بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ

سنگم پبلشنگ ہاؤس ۔ ۵ بینک روڈ ۔ الہ آباد

اجتماعیت کے نئے رجحانات

قانونِ نشو و ارتقا ہر چیز پر حاوی ہے۔ انسان کی نوعی زندگی کی تاریخ اگر دیکھی جائے تو انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف تدریجی سلسلۂ ارتقا ملے گا۔ انسان کا ہر عمل فرد سے شروع ہوا اور جماعت تک پہونچا ایک وقت وہ تھا جب اُسے اپنے وجود کی نوعیت کا علم بھی نہ تھا مگر جونہی اس نے اپنے امتیازی جوہر سے کام لینا شروع کیا اور اس کی آنکھیں کھلیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ تنہا اپنے وجود کے لئے نہیں۔ وسعتِ نظر و علائق کے ساتھ ساتھ احساسِ اجتماعیت کیلئے بھی وسعت پذیر رہا۔ انسان کی حیاتیاتی تاریخ میں اجتماعیت کی طرف زبردست رجحان کے نشانات ملتے ہیں، جسے علمائے فن نے یوں بیان کیا ہے۔

ازمنۂ قبل از تاریخ میں انسان ایک طرح حیوانی زندگی بسر کرتا تھا اور یہ شعور کے عدم استعمال کا نتیجہ تھا مگر جب اس کی آنکھیں کھلیں اور اس نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا تو شعور کچھ اُبھرا اور اس کا اجتماعیت کی طرف پہلا قدم احساس "امومت" تھا۔ تمیز نے کچھ اور ترقی کی تو دوسرا قدم احساسِ "ابوۃ" لیا۔ پھر مادر - پدر اور پسر کے اس چھوٹے سے گروپ نے کچھ مل جل کر رہنا سیکھا اور یہ نتیجہ تھا غالباً خارجی ماحول کا۔ تمدن کی ترقی سے اور خود کو وحشی جانوروں سے بچانے کے لئے اس چھوٹے سے گروپ نے اپنا عائلی نظام مرتب کیا اور ازدواجی تعین کے ساتھ ہی یہ سلسلہ "کنبہ" تک پہونچا۔ کنبے کے چھوٹے پودے نے ترقی کر کے "قبیلہ" کی صورت اختیار کر لی، اور انسانی معاشرہ عرصۂ دراز تک اسی منزل پر رُکا رہا۔ جس کی کچھ نشانیاں اب بھی وسط ایشیا میں ملتی ہیں۔ ہیرو پرستی کی تاریخ کا آغاز بھی اسی منزل سے ہوتا ہے جس پر آگے کچھ کہنا مقصود ہے۔ مگر احساسِ اجتماعیت نے اور ترقی کی اور "بلدیہ" کی منزل تک پہونچا۔ اس مقام پر تقسیمِ کار عمل میں آئی اور انسان کو احساس ہوا کہ وہ تنہا اپنے لئے نہیں بلکہ سوسائٹی کے لئے بھی ہے وہ خود کو سوسائٹی کا ایک فرد سمجھنے لگا۔ اس کے بعد وسعتِ ادراک و تجربہ نے علمِ جغرافیہ کو وسعت بخشی۔ احساسِ "وطنیت" علمِ جغرافیہ کی ہی کرشمہ سازی تھا۔ مگر احساسِ اجتماعیت یہاں بھی نہ رُک سکا اور وسعتِ نظر و علائق نے احساسِ "قومیت" کو جنم دیا جس کی مختلف ازمنہ میں مختلف اقدار رہی ہیں کبھی رنگت پر کبھی جنسیت پر۔ کبھی مذہب پر اور کبھی جغرافیائی حدود وغیرہ پر اس کی بنیادیں رہیں۔

مگر قومیت کے جدید تخیل نے اجتماعی رجحان کے لئے نئی راہیں کھول دی ہیں اور ان کا رخ ایک اور سمت کو

پھیر دیا ہے۔ جس کی تاریخ کا آغاز شخصیت پرستی اور ہیرو پرستی سے ہوتا ہے اس کے پہلو بہ پہلو آبا و اجداد کی پرستش بھی شروع ہوئی۔ ہیرو پرستی نے مطلق العنان اور جابر شہنشاہیت کو جنم دیا اور عرصۂ دراز تک انسان اس کا جوا نہ اُتار سکا۔ جس سے بادشاہوں کی ہستی مافوق الفطرت خیال کی جانے لگی۔ میرے خیال میں "بادشاہوں کے آسمانی حقوق" (Divine Rights of King.) کا نظریہ اسی خیال کے امتداد کا منطقی نتیجہ تھا۔ مگر بادشاہوں کی شخصیت پر پہلی ضرب یہودی مذہب نے لگائی۔ جس نے کہا کہ بادشاہوں کا اخلاقی ضابطہ انتہائی درجہ قابلِ ملامت ہے اور اس طرح ان پر ایک طرح کا روحانی الزام عاید ہوا، بعدہٗ دنیا میں پہلے پہل اہلِ روما نے بادشاہ کے اختیارات پر پابندی لگائی اور بادشاہ بآسانی محافظ سپاہیوں کے ہاتھوں قتل کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے حکومت کے سب صیغے بادشاہ کی شخصیت پر دارومدار رکھتے تھے۔ مگر اہلِ روما نے سول سروس اور ضابطۂ قوانین سے ایک وسیع سلطنت کو چلانے کا طریقہ ایجاد کیا۔ جس سے جمہور کی وفاداری بادشاہ سے ہٹ کر اسٹیٹ کے ساتھ ہوگئی۔ اس سلسلہ میں ارسطو کا نام قابلِ ذکر ہے جس کے پیرؤں کو اس لئے سماج سے نکالا گیا کہ وہ جمہوریت کے حامی تھے۔ کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ اور مذہب کا رابطہ و رشتہ قایم کیا گیا۔ جس سے مذہب کے اُصولِ برادری حکومت میں سرایت کر گئے۔ اور پہلی دفعہ چرچ کی مرکزی گورنمنٹ بنی جس سے ایک ضابطۂ قوانین وجود میں آیا۔ چھٹی صدی عیسوی جنسیت اور ارضیت کے علائق توڑ کر عام انسانیت کا نظریہ پیش کر چکا تھا اسپین اور فرانس میں اسلامی طرزِ حکومت سے یورپ متاثر ہوا۔ جس سے یورپ میں قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا کارنامہ "نمایندہ گورنمنٹ" عرصۂ وجود میں آیا جہاں یہ سسٹم کامیاب رہا وہاں سیاسی استقلال آگیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اور ملکوں میں بھی نمایندہ حکومتوں کا قیام عمل میں آ گیا۔

حقایق کا چناؤ اور تفہیم زمانہ کے تعصبات اور غالب رجحانات کی رعایت سے کیجائے تو اجتماعیت کا بڑا عنصر "دوراندیشی" نظر آئے گا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ انفرادی دوراندیشی اور اجتماعی دوراندیشی۔ قوم میں اگر چند افراد تکلیف اُٹھانا گوارا کرلیں تو دوسروں کا مستقبل آرام سے گزر سکتا ہے اس لحاظ سے دراصل پہلے درجہ پر زراعت اور دوسرے درجہ پر صنعت و حرفت اجتماعی دوراندیشی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔ زمانۂ حال میں اگر چند افراد ثمردار اشجار لگائیں تو نئی پود مستقبل میں اس سے فایدہ اُٹھا سکتی ہے۔ صنعت و حرفت میں ترقی اور مشینوں کی ایجادات نے ایک نئے اجتماعی رجحان کی داغ بیل ڈالی ہے گو آج سے کئی برس پہلے چند سرمایہ دار ہی اس سے متمتع ہوتے تھے مگر آجکل حریت افکار اور جمہوریت کے غالب رجحانات کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری کے خلاف جذبۂ نفرت طاقت پکڑ گیا جسکی پہلی عملی مثال روس میں اشتراکیت کی ملتی ہے۔ اکنافِ عالم میں معاشرے کا قدیم ڈھانچہ پروپیگنڈہ سے ڈھانے کی کوشش کامیاب ہو چکی ہے اب ہر صنعت کو قومی ملکیت بنایا جا رہا ہے۔ مجلسی اجتماعی رجحان جدید آلات کا بڑی

حد تک مرہونِ احسان ہے۔ بارود اور بندوق کی ایجاد نے گورنمنٹ کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں۔ دوسری قوموں سے جنگ کے سلسلہ میں اسلحہ فراواں چاہئے۔ جس کا دار و مدار صنعت و حرفت کی توسیع پر ہے۔ جس سے گورنمنٹ کے لئے جمہوری اور عوامی حکومت ہونا ناگزیر ہو گیا ہے۔ جس سے اجتماعیت کے نئے رجحان شروع ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پچھلی جنگ کا جایزہ لیجئے۔ جس میں فتح اسی بات پر منحصر تھی کہ اپنے وسایل کسی طرح مجتمع کئے جائیں اور ان کا پورا استعمال کیا جائے اور سوسائٹی کے اختلافاتِ باہمی کو التوا میں ڈال کر ہر فرد سے اس کے مناسبِ حال کام لیا جائے۔ یہ "جسمِ اجتماعی" کی بہترین مثال ہے۔ اس سے اجتماعیت کا پہلا اصول "افراد کے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ترجیح حاصل ہے"، شدت سے کارفرما ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے گروپ مثلاً خاندان سوسائٹی وغیرہ کی اہمیت گھٹ رہی ہے۔ سائنس اور صنعت نے آدمیوں کے اشغال کو تنظیم دیکر انھیں ایک بڑے اجتماع یا بڑی سوسائٹی میں سمونا شروع کر دیا ہے۔ انفرادی زندگی کی قدر گھٹ رہی ہے۔ ایک آدمی کے لئے قوم یا جماعت کی خاطر جان قربان کرنا باعثِ فخر ہے۔ شخصی آزادی تقریباً ختم ہونے والی ہے۔ سوسائٹی کا بار افراد کے کندھوں پر بڑھ رہا ہے۔ قومیں آیندہ انفرادی کارناموں پر نہیں بلکہ اجتماعی کارناموں پر فخر کیا کریں گی۔ ہیرو پرستی کا دور اختتام کو پہونچ رہا ہے۔ بڑے بڑے کارناموں کو جماعت سے نسبت دی جائے گی۔ اس کی پہلی مثال سوویٹ روس نے قایم کی۔ دوسری مثال اہلِ امریکہ (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کی ہے جو اس بیان کو اور واضح کرتی ہے۔ امریکہ کے لوگ اپنے شاعروں۔ آرٹسٹوں اور سائنس دانوں وغیرہ پر فخر کرنے کی بجائے قوم کے اجتماعی کارناموں مثلاً جہازوں، پلوں، سڑکوں، ریلوے اسٹیشنوں اور صنعت و حرفت وغیرہ پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ سائنس میں تو یہ رجحان کب کا آچکا ہے۔ اکیلا آدمی لیباریٹری میں کام نہیں کرتا بلکہ مختلف سائنس داں کام کا بٹوارہ کر لیتے ہیں اور مجتمع حالت میں تجربات سے نتایج اور عواقب کی طرف ذہن دوڑاتے ہیں۔ اس بیان کی صحت کو سمجھنے کے لئے پچھلی دو جنگوں نے ایک واضح مثال پیش کی۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیندہ اجتماعیت کس نہج پر استوار ہوگی۔ جنگِ عظیم کے دوران میں کنواری اور شادی شدہ عورتیں بھی جماعت کی ملکیت قرار دیدی گئیں اور انھوں نے اس خیال کے ماتحت بغیر رسم و رواجِ شادی کے ملک کی رضا کارانہ خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ فرانس میں ان بے خاوند عورتوں نے جو بچے جنے وہ جماعت کی ملکیت قرار پائے اور ان عورتوں کو War god mothers. جیسا معزز لقب عطا ہوا۔ پھر یہی عمل پچھلی جنگ میں جرمنی، جاپان، اٹلی وغیرہ میں دُہرایا گیا۔ وہاں یہ عمل ہرگز معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کا خیال ہے کہ وہ بچے اپنے لئے نہیں بلکہ جماعت کے لئے دیتی ہیں۔ آیندہ روس کی پیروی میں بچے اسٹیٹ کے قرار پائیں گے ماں باپ کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا ان کا کام فقط بچے جننا ہوگا، اغلب یہی ہے کہ جرمنی اور جاپان کی پیروی میں زناشوئی وغیرہ کا التزام بھی ہٹا دیا جائے گا۔

اسی طرح علم و ادب میں بھی اجتماعیت کے نئے رجحان کارفرما نظر آتے ہیں، آیندہ ہر ادبی تخلیق افراد کی بجائے جماعت کریگی۔ مثلاً افسانہ نویسی میں ایک شخص افسانہ کا پلاٹ طیار کرے گا، دوسرا اس میں کرداروں کا رنگ بھرے گا، تیسرا اس پر عمارت کھڑی کرے گا، چوتھا اس میں رنگ و روغن سے نقش آرائی کریگا پانچواں صحتِ زبان پر مامور ہوگا اور اس طرح مشترکہ طور پر ایک افسانہ طیار ہوگا۔۔۔ اسی طرح دیگر اصنافِ ادب میں اجتماعی طریق کار کے لئے جدت کی راہیں نکالی جائیں گی۔

محشر تونسوی ام۔ اے

آدمی نے لکھنا کیسے سیکھا

(بہ سلسلۂ ماہ جولائی سنہ ۴۷ء)

عربی حروف کے معنی

کسی زبان کی سادہ آوازوں کے حامل حروف کو حروف تہجی کہتے ہیں۔ عربی کے قدیم حروف ہجاء پر غور کرتے وقت ہمیں موجودہ ترتیب سے عربی کے حروف خاص (ث۔ خ۔ ذ۔ض۔ ظ۔غ) نکال دینا چاہیے، اور اس طرح اُن کی تعداد ۲۲ رہ جاتی ہے۔ اگر آپ ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بعض بامعنی الفاظ کے نشانات ہیں۔ مثلاً ب۔ ج۔ ی۔ س۔ ق اور ر جو علی الترتیب بیت (بہ معنی گھر) جمل (بہ معنی اونٹ) یَد (بہ معنی ہاتھ) اسنان (بہ معنی دانت) فَم (بہ معنی دہن) اور راس (بہ معنی سر) کو مخفف کرنے سے حاصل ہوئے۔

ان حروف کے اصل تلفظ کو یونانی نے بڑی حد تک محفوظ رکھا ہے مثلاً ایلفا (α) اور بیٹا (β) جو الف اور بیت کی دوسری صورتیں ہیں اور جن کی رعایت سے حروف تہجی یا الف با کو انگریزی میں ایلفابیٹ (alphabet) کہتے ہیں۔ یونانی کی مدد سے عربی حروف کا قدیم تلفظ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے مثلاً د کا مماثل یونانی میں ڈیلٹا (δ) ہے اور ل کا لامڈا (λ) ہے عربی میں ڈیلٹا کا تلفظ دالت ہوا اور لامڈا کا لامد اور دال اور لام انھیں کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح و اور ت کے لئے یونانی میں واؤ (ς) اور تاؤ (τ) دو حرف ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ان کا تلفظ جو اب ہے وہی پہلے بھی تھا، لیکن ان کے معنی متعین کرنا مشکل ہے کیونکہ عربی کے لغات جدیدہ میں یہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ اس کے لئے صرف یہی ایک تدبیر رہ جاتی ہے کہ حروف کی قدیم اشکال سے مدد لی جائے۔ مثلاً اگر ہم الف اور بیت کے معنوں کو محو کر کے ان حروف کی شکلوں سے مدد لینا چاہیں تو ہم ناکام نہ رہیں گے کیونکہ الف کے لئے جو شکل بنائی جاتی تھی (∀) اُس میں سینگ اور کان سب نمایاں تھے اور پوری طرح بیل کے چہرے سے مشابہ تھی، اسی طرح بیت کا نشان (٩) پورے طور پر "ایستادہ خیمہ" کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس اصول کو جب ہم دوسرے حروف پر منطبق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ د کے معنی دروازے کے تھے کیونکہ اس کی قدیم شکل (Δ) "درِ خیمہ" کا تصور پیش کرتی تھی۔ س کے معنی نیزہ (W) کے تھے، ہ کے معنی کھڑکی (∃) کے تھے، و کے معنی کھونٹی (Ƴ) اور م کے معنی پانی[1] (〰) کے تھے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تصاویر

---

[1] یہی نہیں کہ اس کے لئے نہر بنائی جاتی تھی بلکہ آج تک بچوں کی زبان میں پانی کو مم کہتے ہیں۔

کی مدد سے معنی متعین کرنا کچھ ٹھیک نہیں ایک ہی تصویر کو کوئی کچھ سمجھتا ہے اور دوسرا کچھ مثلاً Lagarde نے ق (φ , ϙ) کے معنی سوئی کا ناکا متعین کئے تھے لیکن Ewald نے کان بتلائے اور Lenormant نے گرہ۔ اور Halevy ق کی قدیم شکل کو دم دار لنگور سمجھتا تھا، مگر لسانیاتی اُصول کے مطابق تحقیق کریں تو یہ مشکل آسانی سے حل ہو جاتی ہے۔ مثلاً آپ دیکھ چکے ہیں کہ ق کے معنوں پر علماء کے آراء میں کس قدر تضاد ہے اگر میں اس کے معنے پنڈلی مقرر کر دوں تو آپ ق کی قدیم شکل سے اس کو مطابقت کرتا ہوا پاکر چپ ہو جائیں گے لیکن آپ کا شک و شبہ اُسی طرح قایم رہے گا لیکن جب آپ کو یہ بتلایا جائے گا کہ اب یہ لفظ عربی لغات سے نکال دیا گیا ہے مگر انگریزی زبان میں محفوظ ہے جہاں ابتک calf کے معنی پنڈلی کے ہیں تو آپ یک گونہ اطمینان محسوس کریں گے۔

بہت سے عالموں نے ان حروف میں ان کے واضعین کی زندگی کا عکس دیکھنے کی کوشش کی۔ ان حروف میں کچھ تو ایسے ہیں جو ریگستانی زندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کچھ میں وادی نما طرز معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔

اُن سات حروف سے قطع نظر جو اعضائے جسم کے نام ہیں (یعنی ر (راس) بہ معنی سر۔ ع بہ معنی آنکھ، ف (فم) بہ معنی دہن، س (اسنان) بہ معنی دانت، ی (ید) بہ معنی ہاتھ، ک (کف) بہ معنی ہتیلی ق بہ معنی پنڈلی) بقیہ کی تشریح یوں ہوتی ہے:۔

ب۔ د۔ ہ اور و اس قسم کے حروف ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی قوم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کے افراد اینٹ پتھر کے مکانوں میں رہتے تھے جن میں آمد و رفت کے لئے دروازے۔ ہوا آنے کے لئے کھڑکیاں اور کپڑے لٹکانے کے لئے کھونٹیاں ہوتی تھیں لیکن بعض علماء یہ ماننے کے لئے طیار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ب یعنی بیت سے ایک معمولی خیمہ مراد ہو۔ د سے در خیمہ جیسا کہ اس حرف کی شکل سے ظاہر ہوتا ہے ہ سے وہ مدور روزن جو ہوا آنے کے لئے خیمہ کے کپڑے میں کاٹ کر بنایا جاتا ہے۔

پہلے نظریہ کی تائید کئی اور حروف بھی کرتے ہیں چنانچہ آ اور ل[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاشتکاری سے ناواقف نہ تھے م اور ن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ایسی جگہ رہتے تھے جہاں تالاب اور چشمے تھے جن میں مچھلی کا شکار کھیلتے تھے ج (جمل) کے معنی اونٹ کے ہیں اور ص غالباً کسی ایسے لفظ کی یادگار ہے جسکے معنی نیزہ کے تھے یہ کس قدر بدوی زندگی کے حسب حال ہیں۔ باقی بچے دو حرف ت اور ط۔ یہ مقدس حروف ہیں۔ ت صلیب نما نشان کو کہتے ہیں جسے بدو

---

[1] ل لامد کا مخفف ہے اس کے معنوں کا تو ہمیں علم نہیں لیکن اس کی قدیم شکل (۷) پر آنکس کا گمان ہوتا ہے۔ راولسن نے "تاریخ فنقیہ" میں اور ٹیلر نے "حروف تہجی" میں اس کے یہی معنی دئے ہیں، چونکہ عرب و عراق وغیرہ میں ہاتھی نہیں ہوتا اس لئے اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتا۔ اس بنا پر بعض عالموں نے "لامد" کے معنی "جانور ہکانے کا آلہ" لکھے ہیں۔ میں بیل کی رعایت سے لاٹھی مراد لیتا ہوں۔ اسحٰق

ہڈی پر نقش کر کے اونٹیوں کے گلے میں پہناتے تھے تاکہ وہ خوب بجتے دیں اور طہ (طیط) کے معنی سانپ کے ہیں جو وسطی ایشیا میں جھنڈے کا مخصوص نشان بھی تھا اور پرستش کا جزو بھی۔

حروف کے یہ نام بڑے کار آمد ثابت ہوئے ہیں اور اکثر موقعوں پر عالموں کے جھگڑے انھوں نے بڑے انصاف سے چکائے ہیں مثلاً جس وقت سر آرتھر ایوانس نے Scripta Minoa لکھ کر یہ ثابت کیا کہ فنیقیوں نے اپنے حروف تہجی کریٹ کے مہاجرین سے پائے تھے، تو اس پر اعتماد کر کے عالموں نے یہاں تک کہہ دیا کہ فنیقی اور یونانی (جو کہ فنیقی سے ماخوذ تھی جیسا کہ آپ آگے دیکھیں گے) میں ماں بیٹی کا تعلق نہیں ہے بلکہ دونوں بہنیں ہیں جو اقریطی (Cretan) سے پیدا ہوئیں ایسے وقت میں جس نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے صحیح صحیح فیصلہ سنایا وہ خود یونانی حروف کے نام تھے جنھوں نے اپنے سامی النسل ہونے کی پکار پکار کر گواہی دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے بے سر و پا نظرئے رد کر دئے گئے۔

سارے حروف کے یہ نام رکھنے والے کون تھے۔ اسے فنیقیوں سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ حروف کے نام سامی ہیں اور وہ سامی نہ تھے۔

"عرب و ہند کے تعلقات" میں مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۸ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"محققین کا بیان ہے کہ یہ عرب تھے جو ساحل بحرین کے پاس سے اُٹھ کر شام کے ساحل پر جا بسے تھے" ہماری موجودہ تحقیقات اس کے منافی ہے۔

یہودی فنیقیوں کو حام کی اولادیں کہتے تھے۔ اگر وہ سامی ہوتے تو سام کی اولادیں کہلاتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ سامی نہ تھے اور نہ اُن کی زبان ہی سامی تھی۔[1]

علماء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ آرین تھے اور غالباً انھیں لوگوں نے آرین زبان کو بحر روم کے اطراف میں رائج کیا تھا۔[2] انہی وجوہ کی بنا پر Prof Sayce نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یونانی حروف کے نام فنیقی کم اور آرامی زیادہ ہیں۔ اسے تسلیم کر لینے کے بعد یہ مسئلہ نہیں حل ہوتا کہ انھوں نے سادہ آوازوں کے حامل حروف کو ایسے نام کیوں دئے۔

کا کہنا ہے کہ یہ نام بعد کو دئے گئے اور ان کی حیثیت آ سے انجن، ب سے بکری اور ت سے تلوار سے زاید نہیں۔

میں اس باب میں اس بڑے عالم سے اتفاق نہیں کرتا اس لئے کہ اول تو یہ نام بعد کو نہیں دئے گئے بلکہ نہایت پرانے ہیں اتنے پرانے کہ یونانی نے انہی بگڑے ناموں کو اپنایا تھا۔ دوم یہ کہ فنیقی حروف کی شکلیں بڑی حد تک ان ناموں سے مطابقت کرتی ہیں۔

---

[1] Aryan Origin of the Alphabet, Waddell, L.A. page 2.

[2] Rigvedic Culture of the Prehistoric Indus, Swami Sankaranand page 26

Rouge کے نظریہ سے یہ گتھی نہایت آسانی سے سلجھ جاتی ہے اس کی رو سے یہ شرف Hykaos کو بخشا جائے گا دیکھی پہچانی چیزوں کے نام حروف پر منطبق کرنے کی توجیہ یہ ہوگی کہ یہ علم ہونے پر کہ مصری کی وہ ۲۱ تحریری اشکال جن پر ہم نے اپنے نظام تہجی کی بنیاد رکھی ہے کبھی سادہ تصاویر تھیں انھوں نے خود اپنے حروف میں تصویری پہلو ڈھونڈے اور اپنی زبان کی کشادہ دامنی کے باعث ان مفروضہ اشکال کے ناموں کی مبادی اصوات میں شروع سے آخر تک حروفی ترتیب قایم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ علاوہ ازیں حروف جس دورخی زندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ نیل کی وادی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے متاخرین نے حروف کے اس تصویری پہلو کو باقی رکھنے کی کس قدر کوشش کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب فنیقی حروف ایتھوپیا (Ethopia) پہونچے تو اُن میں سے چند کی شکلیں بالکل ہی مسخ ہو چکی تھیں مثلاً نؔ (ᓀ) جو پہلے مچھلی کے منہ سے مشابہ تھا سانپ (ح) معلوم پڑتا تھا اور منہ کی شکل والا پؔ (ᓭ) ناک (ᓗ)۔ یہ دیکھ کر انھوں نے پرانے ناموں کو نکال کر ان شکلوں سے مطابقت کرنے والے نئے نام دئے، نحاؔس اور آنیف۔ اس طرح انھوں نے اپنے نظام تہجی کی حروفی ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے حروف کے تصویری پہلو کو مدھم نہ ہونے دیا۔

ابجد مشہور ہے کہ سنہ ۸۳۲ء میں ابو ادریس کوفی نے عربی کے حروف کو اعداد کا قایم مقام کیا اور آسانی یادداشت کے لئے اُن سے ۸ بے معنی لفظ بنائے[1]۔ یہ بیان درست نہیں۔

حروف کے جس طریق اجتماع کو ابو ادریس سے منسوب کیا جاتا ہے وہ نہایت ہی قدیم ہے کیونکہ بعینہ یہی ترتیب ارامی اور عبرانی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ انگریزی نے بھی بڑی حد تک اس ترتیب کو قایم رکھا ہے۔

اُس زمانہ میں بھی حروف اعداد کے قایم مقام تھے۔ اس کی صحیح توجیہ اب تک نہیں کی جا سکی ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری کا کہنا ہے کہ اظہار اعداد کے لئے ایسا کیا گیا[2]، لیکن مجھے اس کے باور کرنے میں تامل ہے۔ اگر ہم ابجد کی موجودہ ترتیب سے عربی کے حروف خماص نکال دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ارامی اور عبرانی ۴۰۰ سے آگے گنتی نہ جانتے تھے اور ارامی حروف موصول ہونے سے پہلے عرب اعداد کا اظہار کن نشانات سے کرتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ جیسے عربوں نے عربی کے چھ حروف خاص کا ارامی کے اخیر میں اضافہ کیا وہاں انھوں نے تقلیداً اُن کو اعداد کا قایم مقام بھی کیا۔ ایسا کرنے پر سارے نظام تہجی میں ایک سے ایک ہزار تک ایک نظام قایم ہوگیا جس کی عمومی حیثیت نے ایک بہت بڑی حقیقت پر پردہ ڈال دیا۔ اس مضمون میں ہم اسی حقیقت کو منکشف کریں گے۔

حقایق کو اعداد سے سمجھنے کی کوشش نہایت ہی قدیم ہے گو اس کو فنی حیثیت دینے والا مشہور حکیم فیثاغورث تھا بابل[3] کے منجموں نے دیوی دیوتاؤں سے کچھ اعداد منسوب کئے تھے مثلاً رمّن (Ramman) سے ۱۰۔ اشتر (Ishtar) سے ۱۵

---

[1] "ابجد کی ایجاد" از میر کرامت اللہ صاحب۔ رسالہ "زمانہ" دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء — [2] مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم صفحہ ۲۰۸

[3] Encyclopaedia of Religion & Ethics edited by James Hastings 1917 article on "Numbers".

شمس (Shams) سے ۲۰ - مردوک (Marduk) سے ۲۵ - سین (Sin) سے ۳۰ - آئی (Ea) سے ۴۰ - بل (Bel) سے ۵۰ - انو (Anu) سے ۶۰ وغیرہ وغیرہ

ان اعداد اور دیوی دیوتاؤں کے درمیان بڑا تعلق ہے مثلاً سین (Sin) یعنی چاند کے دیوتا سے ۳۰ منسوب کرنے کی وجہ قمری مہینہ کے ۳۰ دن ہیں۔

یہی بات ہمارے حروف پر منطبق ہوتی ہے۔ گو اُن سے منسوب کئے جانے والے اعداد کو ہم سرسری سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ چونکہ ان کے رموزی رشتے کی نوعیت بڑی حد تک مذہبی ہے اس لئے اس قفل ابجد کو کھولنے کے لئے ہمیں مذہب ہی کا سہارا لینا ہوگا۔ میں دوچار حروف پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالوں گا تاکہ ناظرین اندازہ لگا سکیں کہ میں کہاں تک صحیح کہتا ہوں۔

ا ۔ ابجد میں پہلا حرف آ، ایک کا قایم مقام ہے جو یونانی دیومالا کے Thoth Hermes سے منسوب کیا جاتا ہے گویا یہ تکلم کی علامت ہے۔ آرین وِدوانوں نے اُس قوم کی جو سب سے پہلے تکلم سے بہرہ مند ہوئی تھی، Ad کہا تھا جس کے معنی واحد اور اول کے ہیں یہی نہیں ہندوؤں کے برہما کو Adinath یعنی آقائے اول کہتے ہیں اس کا "تھا" سامی میں "سا" سے بدل جاتا ہے اور Adonis کہلاتا ہے جو خود سورج دیوتا ہے جس سے بیل منسوب کیا جاتا ہے اور یہ حرف ظاہری و معنوی طور پر اس سے مطابقت کرتا ہے کیونکہ اس کے معنی بیل کے ہیں اور اسکی پہلی شکل ✓ بھی بیل کے چہرہ سے مشابہ تھی جس میں کان اور سینگ سب نمایاں تھے۔

ہ ۔ ابجد میں حرف ہ عدد ۵ کا قایم مقام ہے گویا یہ ہندی کے म (ما) کے برابر ہے جس کے لئے کبھی کبھی پانچ کونے والا ستارا بنایا جاتا تھا جسے makaram یعنی پانچ کونے والا کہتے ہیں اور خود ستارا عورت سے منسوب کیا جاتا ہے (اسٹار - ایسٹر - ایشتر - ایستر - استارتی - ستارا سب ایستری سے ماخوذ ہیں جس کے معنی عورت کے ہیں) جس کے لئے مصری دائرہ بناتے تھے اور دائرہ عضو سنائی کی علامت ہے اور ہمارا ہ بھی مدور ہے اس سے قطع نظر یہ رحم کو ظاہر کرتا ہے اور ہندی کا پانچ ٥ رحم کی تصویر ہے ۔ اور ہمارا ہ پہلے مدور تھا۔

پانچ کا دُگنا ۱۰ جسے کبھی کبھی ایسے (∞) بھی لکھتے تھے۔ ذات واجب الوجود کے علاوہ دو رحموں کو ظاہر کرتا ہے اور اصل یہ ہے کہ اس نے عربی کے دو چشمی ھ، ہندی کے थ (تھا) اور یونانی کے ε (epsilon) کو جنم دیا۔

ی ۔ یہ حرف بہت پاک مانا جاتا ہے، کیونکہ یہ خدا کے مقدس نام "یہوا" کا پہلا حرف ہے۔ عیسائی مذہب میں تو ابتک خدا کا اظہار عبرانی کے "ی" کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ ابجد میں یہ عدد ۱۰ کا قایم مقام ہے جس کا تلفظ ۱۰ کیا جاتا ہے، ۱۰ کو بسا اوقات ایسے ⓘ لکھتے ہیں اور یہ خدائے پیدائش کی علامت ہے جس کا اظہار بسا اوقات ہاتھ کی شکل میں کیا جاتا ہے اور خود اس حرف کے معنی ہاتھ کے ہیں۔

ط۔ خدائے پیدائش کی تعریف میں اکثر کہا گیا ہے کہ وہ آ اور ۹ ہے گویا ۱۰ آ ہے۔ ا۔ اور ۹ کے قایم مقام ہمارے نظام تہجی میں آ اور ط ہیں۔ ان کے معنی بیل اور سانپ کے ہیں اور یہ مشہور واقعہ ہے کہ یہودیوں نے ایک سونے کے بچھڑے اور پیتل کے سانپ کی پرستش کی تھی۔

م۔ میم کے معنی پانی کے ہیں۔ ابجد میں یہ عدد ۴۰ کا قایم مقام ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی عدد بابل کے پرستاران اختر پانی کے دیوتا [illegible] سے منسوب کرتے تھے۔

ن۔ ابجد میں یہ عدد ۵۰ کا قایم مقام ہے اس کے معنی مچھلی کے ہیں لیکن مصری میں نون پانی کو کہتے ہیں چنانچہ مُردے کی کتاب میں [illegible] اپنے کو نون یعنی پانی سے پیدا ہوئی قوت خلاق بتاتا ہے حالانکہ دیگر روایات کی رو سے وہ آسمان کی دیوی نوط کا لڑکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوط اور نون ایک ہیں۔ آسمان کو پانی بتانا یا پانی کو آسمان بتانا کوئی نئی بات نہیں۔ رگ وید میں اکثر جگہ سمندر کہہ کر آسمان مراد لیا گیا ہے۔ خود آسمان کی دیوی کی تصویر ایسے بنائی جاتی ہے کہ وہ اپنے چاروں ہاتھ پاؤں سے زمین پر کھڑی ہے اور اس کے بازو یا ٹانگوں پر کشتی چل رہی ہے جس میں [illegible] اور [illegible] بیٹھے ہیں۔ مصری تحریری اشکال میں آسمان کے لئے یہ نشان بتایا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آسمان کو مصری ایک ایسی مسطح چھت خیال کرتے تھے جس کے کنارے اُفق پر جھکے ہوئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ مصری میں اس کے علاوہ پاتال لوک کے آسمان کے لئے بھی ایک نشان (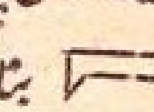) پایا جاتا ہے اور جب ہم ان دونوں کو ملا کر 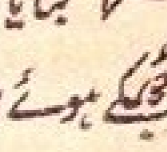 اندرونی خطوط کو ملاتے 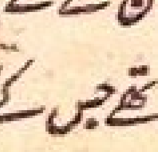 بڑھاتے ہیں 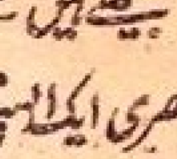 تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشان الافلاک بابل کے زائچے سے ماخوذ ہیں اور اس طرح گویا یہ نشان اصل میں اس نشان کی مختصر شکل ہے۔

جب ہم بابلی زائچے کے اعداد ان گھروں میں بھر کر جمع کرتے ہیں تو اُن کا مجموعہ ۵۰ ہوتا ہے اور یہی عدد ہمارے نون سے منسوب کیا جاتا ہے۔

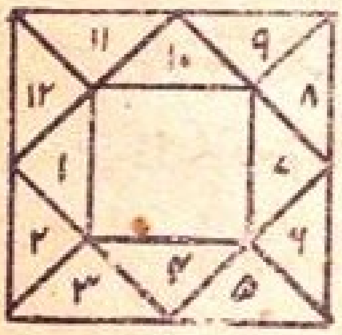

ان دو چار مثالوں سے ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ پہلے یہ اعداد حروف رموز مذہبی کے اظہار کے لئے مستعمل تھے جسے صرف خاص خاص لوگ سمجھ سکتے تھے اور پھر عوام نے انکی ظاہری حیثیت دیکھ کر اظہار اعداد کا کام لینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ان کا رموزی استعمال شروع ہوا چنانچہ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اعداد میں الفاظ پنہاں کئے گئے اور کبھی الفاظ میں اعداد۔ آخر الذکر کو تاریخی مادے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً:۔ آہ غالب بمرد۔ میں آنے والے اعداد کو اگر ہم جمع کریں تو ہمیں غالب کے انتقال کا سنہ معلوم ہو جاتا ہے۔۔۔ اول الذکر کی مثال دفینہ وغیرہ کی تفصیلات ہیں جنہیں بجائے حروف کے اعداد استعمال کئے جاتے تھے اور جنھیں تعویزی شکل میں لکھا جاتا تھا۔

یونانی جس وقت یونانیوں نے باقاعدہ طور پر شہروں میں رہنا شروع کیا اُس وقت تک وہ فن تحریر سے نابلد تھے جب ایک شہر دوسرے شہر سے معاہدہ کرتا تھا تو اس کو یاد رکھنے کے لئے کچھ آدمی ہر شہر میں ہوا کرتے تھے جنھیں Remembrancers کہتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق جسے چار مورخوں[1] (Tacitus, Diodorus, Plato, Herodotus) نے نقل کیا ہے Cadmus نے فنیقی کو یونان میں اُس وقت رائج کیا تھا جب وہ Europa ملک کی تلاش میں نکلا تھا ٹیلر کا کہنا ہے کہ Europa سے مراد مغرب ہے اور Cadmus ایک سامی لفظ ہے جس کے معنی "اہل مشرق" ہیں اور اس سے کوئی فرد واحد مراد نہیں بلکہ فنیقی تاجر مراد ہیں اس طرح اس روایت میں محض فنیقی تاجروں کی یونان کی دریافت کی طرف اشارہ ہے[2] لیکن ویڈل نے ثابت کیا ہے کہ Cadmus واقعی میں ایک انسان تھا اُس کا باپ Agenor, Trojan کی لڑائی میں پیش پیش تھا اُس کے ایک بھائی کو Achilles نے موت کے گھاٹ اُتارا تھا اور وہ خود اپنے باپ کی غیر موجودگی میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالے تھا اُسوقت وہ جوان تھا کیونکہ Troy کے محاصرے کے چند ہی سال بعد اُس کی بیٹی Ino نے Odusseus کو اُس کی جہاز کی بربادی پر ڈوبنے سے بچایا تھا۔ چونکہ یہ لڑائی بارھویں صدی ق-م میں ہوئی تھی اس لئے وہ اسی دوران میں تھا[3]۔

یونان میں فن تحریر کا رواج شروع میں نہایت ہی محدود رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے کے علماء و فضلاء تک تصنیف و تالیف کے کام کو برا جانتے تھے اس کا اندازہ سقراط کے اس قول سے ہوتا ہے کہ "علم الٰہی اور رموز حکمت کا مردار جانور کی کھال پر رہنے سے انسان کے زندہ دل پر رہنا اچھا ہے۔" افلاطون اور ارسطو نے اس باب میں سقراط سے انحراف کیا چنانچہ افلاطون نے قریباً ۶۱ اور ارسطو نے ۱۲۰ کتابیں مختلف علوم پر لکھی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ انھیں کے زمانے میں اندھے شاعر ہومر کی رزمیہ نظمیں پہلی مرتبہ قلمبند کی گئی تھیں۔ یونان میں علمی دور کا آغاز انہی حکماء سے ہوتا ہے بعد میں فن تحریر کا کتنا رواج ہوا اس کا اندازہ کتابت سے ہو سکتا ہے جن کی تعداد ۱۸ - ۱۹ ہزار سے کم نہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں[4] صدی ق-م تک یونانی نے انفرادی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

یونان میں[5] دو خط رائج تھے ان کے اصطلاحی نام قدیم اور جدید فنیقی (Old & New Attic) ہیں۔

The Alphabet by Isaac Taylor, vol. II page 19. [1]

Aryan Origin of the Alphabet by L. A. Waddell pp. 67-68 [2]

Dawn of Mediterranean Civilisation by Angelo Mosso page 35. [3]

The Alphabet vol II page 27. [5] The Alphabet, Taylor, vol. I p 15 [4]

عتیقی جدید جو یونان کا معیاری رسم الخط تھا فنیقی سے ماخوذ تھا اور عتیقی قدیم لیدی (Lydian) سے جس میں ارآمی رنگ نمایاں تھا۔ اس طرح یونانیوں کے اُستاد بننے کا شرف کہیں ایک کے حصے میں نہیں آیا ہے بلکہ برابر برابر دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

قدیم یونانی پہلے سامی طرز پر دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی تھی لیکن پھر حروف کو اُلٹ کر بائیں سے دائیں کو لکھی جانے لگی۔ اس بڑے انقلاب کی درمیانی کڑیاں Thera میں دیکھنے کو ملتی ہیں جہاں کے کتابت کے طرز تحریر کو Boustrophedon کہا جاتا ہے اس کے مطابق کھیت جوتنے کے اُصول پر پہلی سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری اُسی کو جاری رکھتے ہوئے بائیں سے دائیں کو لکھی جاتی ہے اور تیسری پھر پہلے کی طرح۔ یہ حطیوں کی نقل ہے جو مدور الواح پر چکر دار تحریر لکھتے تھے۔

موجودہ انگریزی حروف اور اب سے ہزار سال پہلے کی یونان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عبوری دور میں پہلے پتھر پر کتابت کا چلن رہا اور پھر چمڑے پر۔ دونوں ہی پر نہایت احتیاط سے لکھا جاتا تھا جس کے باعث حروف کی شکلوں میں بہت کم انقلابات رونما ہوئے یہ تو کاغذ ہی کی ایجاد پر ممکن ہو سکا۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ انگریزی کے بڑے حروف جو رومن کہلاتے ہیں رومن نہیں ہیں کیونکہ انگلستان میں ہم ان کا چلن روم کی بنیاد پڑنے اور رومیوں کے برسر اقتدار ہونے سے کئی صدی پہلے سے پاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کہ G, J, F اور W نو ایجاد حروف ہیں۔ اول الذکر دو C اور I سے F اور W, V سے حاصل ہوئے۔ F کا ارتقاء یہ ہے Y 7 7 W, UU کی دوہری شکل ہے جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے۔

(بقیہ حروف کے لئے دیکھئے نقشہ نمبر ۲)

Aryan origin of the Alphabet, L.A. Waddell p. 66 ۱

" " Alphabet, L.A. Waddell p. 22 ۲

نیاز فتحپوری کے قلم سے

تین جدید مطبوعات

مختارات نیاز - افسانوں کا چوتھا مجموعہ — ۸ روپیہ

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) — ۸/۶

اصحاب کہف (ڈرامہ) — ۱۲ آنہ

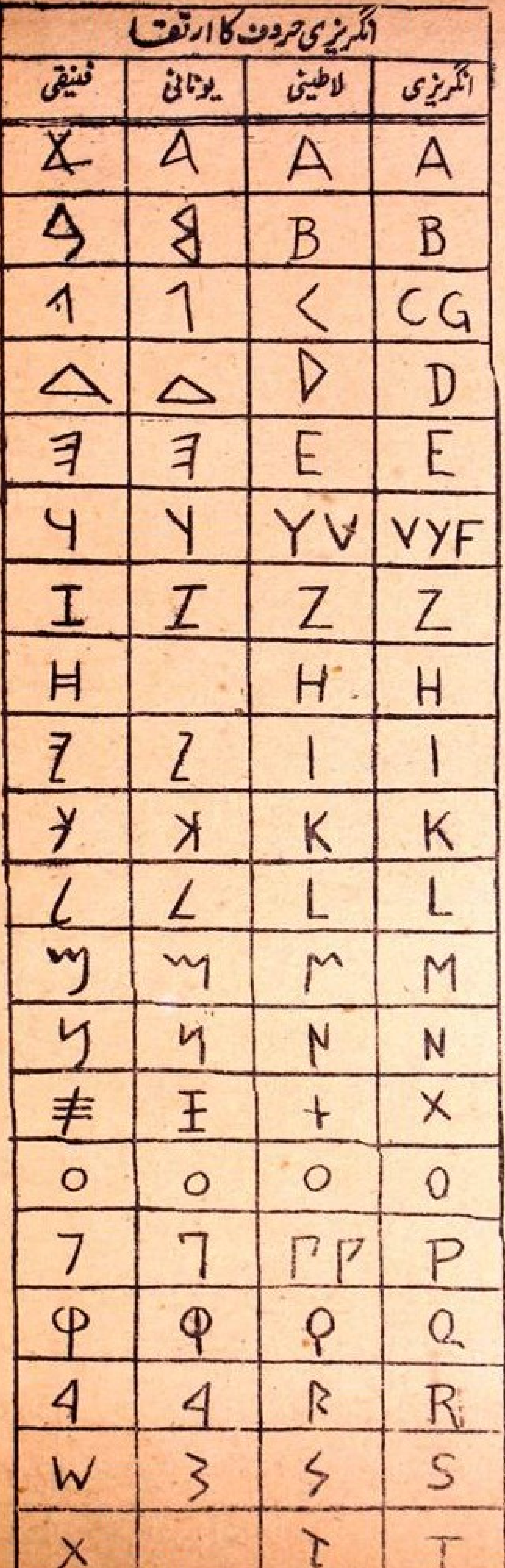

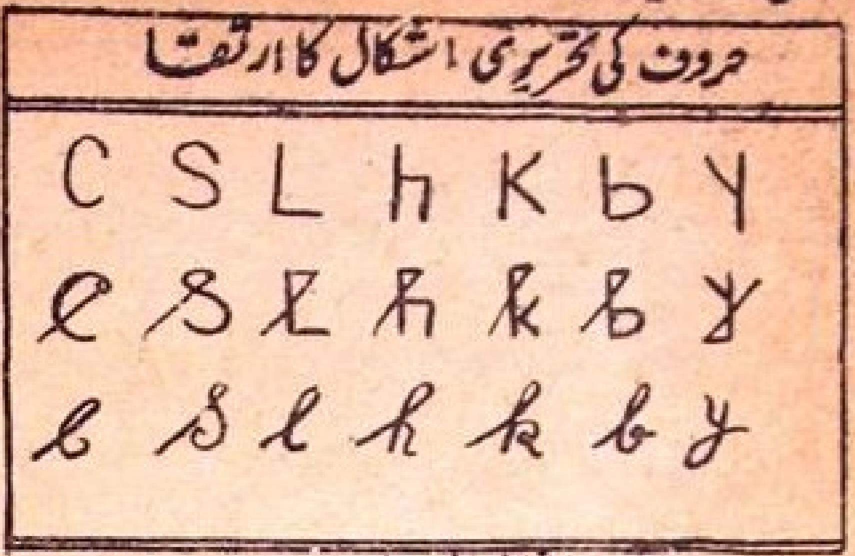

(نقشہ نمبر ۸)

(نقشہ نمبر ۹)

ہماری اُردو میں قاعدہ ہے کہ حروف کو جوڑتے وقت اُن کی آخری کششوں کو محذوف کر دیتے ہیں لیکن انگریزی میں سوائے H اور B کے (جن کے لئے نصف اشکال بنائی جاتی ہیں) آڑے ترچھے خطوط کا اضافہ کیا جاتا ہے اسے نقشہ نمبر ۸ سے سمجھا جاسکتا ہے۔
دیگر تحریری حروف کیسے بنے اسکے لئے دیکھئے نقشہ نمبر ۹۔

(باقی) اسحاق لکھنوی

انشاء کی شاعری

غزل — اُردو شاعری میں غزل کی اہمیت مسلم ہے، وَلی کے زمانہ سے لیکر دورِ جدید کے آغاز تک وہ شخص شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جو غزل نہ کہہ سکے چنانچہ کچھ عرصہ قبل تک بلکہ اب بھی ہر مبتدی اسی صنف سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ انشا کی شاعری کا آغاز بھی غزل ہی سے ہوا۔

عام طور پر مشہور رہے کہ انشاء بے اُستادے تھے یہ نتیجہ اس لئے اخذ کیا گیا کہ کوئی باوثوق شہادت ہمیں اس بارے میں نہیں مل سکی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ دستور کے خلاف ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ اُس زمانہ کا یہ عام رواج تھا کہ ہر مبتدی شاعر کسی نہ کسی اُستاد کے سامنے زانوئے شاگردی ضرور تہ کرتا تھا اور اپنی شاعری میں اُستاد کے رنگ کی پیروی کو آیندہ ترقی کا وسیلہ سمجھتا تھا۔

ابتدائی رنگ — چنانچہ میر انشاء اللہ کے ابتدائی کلام میں کثرت سے اور بعد کے کلام میں کہیں کہیں ہمیں اس زمانہ کے مشہور اُستاد میر سوز کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ ظرافت اور خوش طبعی میر سوز کا خاص رنگ ہے اور یہی چیز انشاء کے کلام میں بھی پورے طور پر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ انشاء کی جو دوسری اہم خصوصیت یعنی عربی جملوں کو مصرع کی صورت میں اشعار کے اندر چسپاں کرنے کی ہے وہ بھی میر سوز ہی کی پیروی پر دلالت کرتی ہے۔ انشاء کا کلیات اس قسم کے اشعار سے پُر ہے۔ مثلاً :—

اے عشق مجھے شاہدِ اصلی کو دکھالا — قُم خذ بیدی وفقک اللہ تعالیٰ (میر انشا)

یہی چیز ہم میر سوز کے ہاں پاتے ہیں مثلاً :—

کچھ کہہ تو قاصد آتا ہے وہ ماہ، الحمد اللہ الحمد اللہ — جھوٹے کے منہ میں آگے کہوں کیا۔ استغفر اللہ استغفر اللہ (میر سوز)

ہمارے اس قیاس کی تائید میر حسن کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے انشاء کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔ "نو مشق است اکثر طرز او بطرز میر سوز میماند"[1] لیکن ہمارے اس قیاس سے یا میر حسن کی عبارت سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ انشاء نے میر سوز کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انشاء نے ابتدا میں میر سوز کا دیوان پڑھا ہوگا۔ ان کا طرز پسند کیا ہوگا اور اس کی پیروی اختیار کی ہوگی۔

---

[1] تذکرہ میر حسن مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۵۵

مگر اس بارہ میں میرا خیال ہے کہ انشاؔ اپنی ابتدائی عمر میں سوزؔ سے ملے ہیں اور باقاعدہ شاگرد بھی ہوئے ہیں خواہ یہ شاگردی کا زمانہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ میر سوزؔ کے حالات زندگی سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں وہ مرشد آباد گئے تھے لیکن بہت جلد لکھنؤ واپس آئے۔ ہماری رائے میں اسی عرصہ میں انشاؔ نے سوزؔ کو اپنا کلام دکھایا ہوگا اور سوزؔ کے طرز کا اثر قبول کیا ہوگا۔

انشاؔ اور میر سوزؔ کی باہمی ملاقات کے بارے میں ہمارے قیاس کو اس چیز سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ انشاؔ کی شعر خوانی کا اندازہ تذکرہ نویسوں نے وہی لکھا ہے جو میر سوزؔ کا مخصوص انداز تھا۔ مثلاً شعر کو اس طرح پڑھنا کہ خود مضمون کی صورت ہو جائے۔ شعر خوانی میں یہ اداکاری انشاؔ اور سوزؔ دونوں کے ہاں مشترک ہے۔

بہر حال اُستادی شاگردی کے بارے میں یہ قیاس آرائی صحیح ہو یا غلط یہ مسلّم ہے کہ انشاؔ کا ابتدائی کلام میر سوزؔ کے طرز پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میر سوزؔ کے کلام کی خصوصیات کیا ہیں اور انشاؔ اپنے ابتدائی کلام میں اس کی پیروی میں کس قدر کامیاب ہوئے۔

ظرافت، خوش طبعی، عربی جملوں کو چسپاں کرنا میر سوزؔ کا خاص انداز ہے اور یہی چیز انشاؔ کے ہاں بھی بہت اہمیت رکھتی ہے ——— اس کے علاوہ میر سوزؔ کے کلام کی دیگر خصوصیات سلاست زبان شیرینیٔ بیان کا موجود ہونا اور تصنع و تکلف کا ناپید ہونا ہیں۔ یہ صفات بھی ہمیں انشاؔ کے ابتدائی کلام میں بدرجۂ اتم ملتی ہیں مثلاً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

گالی سہی جفا سہی چینِ جبیں سہی، یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
منظور ہم کو دل کا لگانا ہی جب ہوا کیا آپ کا اجارہ ہے اس میں کہیں سہی
ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اسکے ہم انشاءؔ بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

میر سوزؔ کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں عاشق و معشوق کا مکالمہ لکھتے ہیں۔ انشاؔ نے بھی شروع میں یہی طرز اختیار کیا تھا اور کامیاب ہوئے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

بندہ جب اسے نظر پڑا ہے بولا ہے چل اُٹھ کدھر پڑا ہے
نالہ ہی تجھے تو کھینچ لایا، رونے کا اثر ابھی پڑا ہے
یوں سب سے نہ مل کہا تو بولا تیرا ہی تو مجھ کو ڈر پڑا ہے
جی سے ہیں اپنی جان کے صدقے، یعنی اس نوجوان کے صدقے،
کھا قسم جھوٹ بولے ہے کتنا چُپ رہو چُپ بس قرآن کے صدقے

میر سوزؔ کا کلام محاورہ کی صفائی اور لطف زبان کے لئے بہت مشہور ہے، تشبیہ، استعارہ اور فارسی ترکیبیں

نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سیدھا سادھا مضمون باندھتے تھے اور اسی طرح آسان طرحیں اختیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غیر معروف اور وہ ہندی الفاظ جو میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کے اثر سے متروک ہو گئے تھے۔ میر سوز کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں ہو بہو یہ تمام خصوصیات انشاء کے ابتدائی کلام کی بھی ہیں۔ میر سوز نے اپنے اشعار میں لفظ "بھلا رے" کا استعمال کیا ہے مثلاً میر سوز کا ایک شعر ہے:

بھلا رے عشق تیری شوکت و شان بھائی میرے تو اُڑ گئے اوسان

چنانچہ انشاء کے کلام میں بھی ہم اس لفظ کا جا بجا استعمال پاتے ہیں مثلاً ایک شعر پیش کیا جاتا ہے:

جمال و عظمت دادار خالق ملکوت خیال کر کے یہ کہتا ہوں بھلا رے جبروت

انشاء کی شاعری کا دہلوی دور — انشاء کی اس زمانہ کی غزلیں دہلوی طرز غزل گوئی کا اچھا نمونہ ہیں صرف ایک تصوف کو نظر انداز کر دینے کے بعد ان غزلوں میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دہلوی طرز کا طرۂ امتیاز ہیں۔ داخلیت اس زمانہ کے کلام میں رچی ہوئی ہے اور وہ خارجیت جو لکھنؤ کے اثر سے انشاء کے کلام میں پیدا ہوئی ان غزلوں میں مفقود ہے نمونہ کے طور پر ہم انشاء کی اس زمانہ کی صرف ایک غزل پیش کریں گے اور یہ وہی غزل ہے جو عام و خاص سب کی زبان پر اب تک موجود ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشاء کی یہ غزل اسی سوز و گداز، درد و غم اور سپردگی و خستگی کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے جو داخلی شاعری کی روحِ رواں ہے۔

انشاء کے کلام کا اگر سنہ وار ترتیب کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو لکھنؤ پہونچنے سے قبل کا تمام کلام انھیں عاشقانہ جذبات و کیفیات سے مملو ملے گا جو داخلی شاعری کے بعض مشہور شعراء میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ لکھنؤ کے قیام نے ان پر لکھنؤ کا رنگ طاری کر دیا تھا۔ بایں ہمہ انشاء کے اس دور کے کلام میں بھی داخلی شاعری

کے اثرات دبے ہوئے ملتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو وہ پورے طور پر نمایاں ہو گئے ہیں مثلاً یہ رنگ ملاحظہ ہو:

دل لگایا ہے کہیں انشاؔر نے شاید دوستو ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

انشاؔر کی شاعری کا لکھنوی دور - انشاؔر کی شاعری کا یہ سب سے زیادہ طویل دور ہے اور ان کی شاعری کی جو شہرت آج تک قایم ہے وہ اسی دور پر مبنی ہے۔

اور یہاں ہم انشاؔر کی شاعری کے اسی پہلو کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں انھوں نے اپنی افتاد طبیعت سے زیادہ اپنے ماحول کی قدروں کے مطابق طبع آزمائی کی۔

معاملہ بندی - معاملہ بندی کے موجد اگرچہ قلندر بخش جرأت ہیں، لیکن انشاؔر اس ضمن میں ان سے کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں، فرماتے ہیں:

جاڑے میں کیا مزہ ہو وہ تو سمٹ رہی ہوں اور کھول کر دُلائی ہم بھی لپٹ رہے ہوں
جی چاہتا ہے اے دل ایک رات ایسی آوے مطلع ہو صاف ستھرا دل بھی چھٹ رہے ہوں
سوتے ہوں چاندنی میں وہ منھ لپیٹے اور ہم شبنم کا وہ دوپٹہ بیٹھے اُلٹ رہے ہوں

اس پست مضمون کے اندر بھی انشاؔر نے اپنی طبعی ظرافت و شوخی سے ایسے ایسے لطیف اشعار کہے ہیں کہ ایک مرتبہ سنجیدہ سے سنجیدہ شخص بھی اس بد مذاقی کو نظر انداز کر کے انشاؔر کی برجستگی، بیساختگی اور شگفتگی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکیگا۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

گر ناز نہیں کہنے سے بُرا مانتے ہو تم، میری طرف تو دیکھیو میں ناز نہیں سہی
اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

ریختی - ریختی میں بھی سید انشاؔر نے وہ گل کھلائے ہیں کہ میاں رنگینؔ کا رنگ ان کے مقابلہ میں پھیکا پڑ گیا رنگینؔ کہتے ہیں:

ہیں تو وہ اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی باجی مجھے اُڑھا دو جھلاجھل کی اوڑھنی

اور انشاؔر کہتے ہیں:

چبھتی ہے یہ نگوڑی مسلسل کی اوڑھنی لادے وہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی

ظاہر ہے کہ جو جان انشاؔر کے شعر میں ہے وہ رنگینؔ کے شعر میں نہیں۔ انشاؔر کے دیوان ریختی سے چند اور اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

مجھ سے نہ اُڑ زناخی نورات کو کہیں تھی ہے رنگ کوئی چھپتا ایسی ملی دلی کا
بندی کی دشمنی میں ناحق جو ہوں الٰہی، لگ جائے ان کے منھ پر از غیب کا تھپیڑا

مردوا مجھ سے کہے ہے چلو آرام کریں جس کو آرام وہ سمجھے ہے وہ آرام ہو نوج

لکھنوی دبستان شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم بیان کر آئے ہیں کہ ایک ہی زمین میں متعدد غزلیں لکھنا اس زمانہ میں کمال سمجھا جاتا تھا چنانچہ انشاءؔ نے اس طرف بھی زور طبع دکھایا۔ مثلاً ان کی ایک غزل ہے:-

ہے جی میں قفل خانۂ خمار توڑئے یعنی در بہشت کو یکبار توڑئے

اس زمین میں انھوں نے کئی غزلیں لکھیں۔

انشاءؔ کے کلیات میں متعدد غزلیں ایسی ہیں جن کے قافیہ و ردیف مشکل ہیں اور ان کو سلیقہ سے نباہنا ہر ایک کا کام نہیں لیکن انشاءؔ اس کوشش میں بھی اکثر جگہ کامیاب ہیں مثلاً:-

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو چھوڑ دے گا وہ بھلا دیکھئے لو اور سنو

یہ بھی انصاف ہے کچھ سوچو تو اپنے دلمیں تم تو سو کہہ لو مری کچھ نہ سنو اور سنو

ہیں آپ جیسے یوسفِ کنعاں بعینہٖ چھب آنکھ ناک منھ لب و دنداں بعینہٖ

ہے جلوہ گر پری کی طرح تیری چال ڈھال کھڑا وہ گات سیب زنخداں بعینہٖ

کوچہ کو تیرے کیوں نہ کہوں راہ کعبہ میں ریگِ رواں و دشت مغیلاں بعینہٖ

مشکل قافیہ

جمال و عظمت و داور خالق ملکوت خیال کر کے یہ کہتا ہوں بجلّہ ری جبروت

نمود سطوتِ پروردگار ہے دیکھو جہاں تلک کہ کرے کام یہ نظر کا سوت

محیط میں ہے وہ تمثال جلوۂ واجب اگرچہ آئینۂ ممکنات ہے ناسوت

زہے کریم کہ کروبیوں کو جس نے دیا مدام مشغلۂ سیر گلشنِ لاہوت

حسن حسینؑ کی خاطر سے بخش دیویگا گناہگاروں کو قصر زمرد و یاقوت

کہ جس میں سیکڑوں حوریں ہزار ہا غلمان ہر ایک مثل قمر کے بدون ریش و بروت

بہ بین سبحہ سبحان ربی الاعلیٰ، عطا کرے جو تفضل سے قدسیوں کا قوت

بغیر اس کے کرم کے نہیں بن آتی بات ہزار اگرچہ پڑھا کیجئے دعائے قنوت

بیان ذات کے اوصاف کس سے ہوں انشاءؔ
صفات جس کی ہیں جمال عرش ہیں مبہوت

انشاء کے اشعار کی دیگر ظاہری خصوصیات

مندرجۂ بالا خصوصیات کے علاوہ ہم انشاء کے کلام کی چند اور ایسی ظاہری خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی شاعری سے زیادہ ان کے تبحر علمی اور زباندانی پر دلالت کرتی ہیں ہم نے اس عنوان کے تحت ایسی عام خصوصیات مثلاً تشبیہ و استعارہ وغیرہ جو ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں تضیع اوقات کے ڈر سے نظر انداز کر دی ہیں۔

محاورات :

ہوا پیدا یہ دو دل سے ہی کوہ قاف کا جوڑا — کہ واں پریوں نے ایک قصہ مرے اوصاف کا جوڑا
دو گھڑی دن سے کہا میں نے کہ کیا ارشاد ہے — سن کے بولے اب ہوا کھا بات تیری یاد ہے
گلنے کی دال یاں نہیں بس خشکہ کھائیے — اے شیخ صاحب آپ نہ شیخی بگھاریے
ہے کون سی یہ وضع بھلا سوچئے تو آپ — باتیں ادھر کو کیجئے اور اُدھر آنکھ ماریے

لکھنوی معتقدات :

منھ پہ جوگی کے گھڑا ویں جو بٹک مارے ہے — بس توکل پہ فقط باندھ کمر لیتا ہے
نہ کوئی دیکھے اسے اور وہ سب کو دیکھے — ٹوپی اس روپ کی کب کوئی نڈر لیتا ہے
ضد سے ہر شاخ کی وہ بھقنے کی صورت نجار — ہاتھ میں ایک کوئی نو من کا تبر لیتا ہے

رسومات :

کون سی حور یہاں کھیلنے پہ جو تکتی آئی — بوئے گل لے کے جو پھولوں کی چھڑی مجھ سے لڑی

اصطلاحات موسیقی :

گھنی ان سروں میں سے آگئی مجھ سے ایک عروس کی باس — ابھی انشاء اپنا ہو بس اگر تو لپٹ ہی جاؤں بھاگ سے
یہ راگ اور لائے نیا وہ کہ کہتے ہیں — ٹپّہ تو مجھ سے سن لیا دے گا خیال تو

ہندی تلمیحات :

سانولے پن پہ غضب ہے وسیج بسنتی شال کی — جی میں ہے کہ بیٹھیئے اب جے کنہیا لال کی
ہٹ تیرے راجہ نل کی تو اُڑ جائے حق کرے — ننگا سا کوئی سور ہے رانی دمن کے ساتھ

لکھنوی زبان :

گئے ہم جو انکے گلے لپٹ تو چمٹ کے سینے سے بولے جھٹ — کہ دل صدقے ایسی جھپٹ کو ہٹ مری چھاتی بس سے اُدھڑ گئی

لکھنوی معاشرت:

دید کر ڈالا بس اس نے عالمِ لاہوت بہت ۔۔۔ جس نے بنگ کی صافی میں چھانی آپ کی

انشاء کے اشعار کی معنوی خوبیاں ۔ اب ہم انشاء کے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جو اپنی معنویت کے اعتبار سے انشاء کے ایک بڑے شاعر ہونے پر دال ہیں اس کے علاوہ اس امر کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں کہ انشاء کو اپنے زمانہ کے لغو موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کے علاوہ تصوف اور عشق حقیقی وغیرہ جیسے سنجیدہ موضوعات پر بھی فکر کرنا آتا تھا۔

فلسفیانہ:

جمعیت اجزا کا کل نام ہے اے انشاء ۔۔۔ ہر چند کہ جز ہیں پر موجد ہیں ہمیں کل کے

زاہد مرے مولا کے اسرار نہیں پاتا ۔۔۔ غافل اسے کیا پاوے ہشیار نہیں پاتا

متصوفانہ:

بس نہ دنیا کی رکھ اے صاحبِ ادراک ہوس ۔۔۔ خاک ہے خاک ہے سب، خاک کی کیا خاک ہوس

سلطنت بیچتے ہیں دردکشاں خاک کے مول ۔۔۔ ہے یہاں سایہ ہما کا خس و خاشاک کے مول

عشقِ حقیقی:

جو گھڑی یاد میں تری کٹ جائے ۔۔۔ وہی آٹھوں پہر کی پونجی ہے

عشقِ مجازی:

عشق وہ پھل ہے کہ جس کے تخم ہیں یہ اشک سرخ ۔۔۔ بیخودی ہے مغز ان کا اور چھلکا اضطراب

اس کے ہم صدقے مٹایا جس نے باہم کر کے خلط ۔۔۔ آتشِ تیز ہوا و آب و گل کا اضطراب

آج عاشق کو ترے قبر میں رکھتے ہیں لوگ ۔۔۔ دفن اک زلزلہ ہوتا ہے زمیں کی تہ میں

دل لگا یا ہے کہیں انشاء نے شاید دوستو ۔۔۔ ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

ہے نہاں لطف و کرم چینِ جبیں کی تہ میں ۔۔۔ ہاں چھپی صاف ہے اک ان کی نہیں کی تہ میں

جذبات کی عکاسی:

یہ پیاس اپنی بجھے برف سے نہ شورے سے ۔۔۔ بجھے تو نرگسِ ساقی کے آبخورے سے

آزادگی خوش آئی انشاء کو جب سے یارو ۔۔۔ وہ سب کو چھوڑ بیٹھا سب اسکو چھوڑ بیٹھے

مری اور اس کی وہ صحبت ہوئی بروز وداع ۔۔۔ کہ دردمند سے ہو جیسے دردمند جدا

کہا یہ صبر نے دل سے کہ لو خدا حافظ ۔۔۔ حقوق بندگی اپنا تمام میں نے کیا

جی میں کیا آگیا انشاءؔ کے بیٹھے بیٹھے
کہ پسند اس نے کیا عالم تنہائی کو

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہو گئی
دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہو گئی

جفائے آسماں و بے ثباتی عالم :

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اس کی ہم انشاءؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاءؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

قنوطیت :

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خمریات :

لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی
بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت

شوخی و ظرافت :

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے
زاہد نہیں ہیں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

اوصاف ہیں زیادہ نہ حد اپنی آدمیں
لیکن جو پوچھیے تو اثر خیر و عافیت

متفرق :

کیا خدا سے عشق کی میں رونمائی مانگتا
مانگتا بھی اس سے تو ساری خدائی مانگتا

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دن کے عرشِ کبریائی مانگتا

صحرائے لق و دق میں سلگتا ہوں آپ ہی آپ
وہ آگ ہوں گیا ہو جسے کارواں چھوڑ

ربط کر بوئے گل و بادِ سحر سے پیدا
آخر اے ہوش یہ ہے ہمسفری کا عالم

برق چشمک زن ہے ساقی ابر ہے آیا ہوا
جام مے دے تو کدھر جاتا ہے مچلایا ہوا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

حیف ایام جوانی کے چلے جاتے ہیں،
ہر گھڑی دن کی طرح ہم تو ڈھلے جاتے ہیں

چند مدت سے فراق صنم و دیر تو ہے
چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رحمت نبی خاں ایم۔ اے (علیگ)

قدیم سنسکرت لٹریچر

(بہ سلسلۂ ماہ جولائی ۱۹۴۷ء)

خلاصہ یہ کہ قوم۔ مذہب اور وطن کی محبت نے معلوماتِ جدیدہ سے اثر پذیر ہو کر تاویلات کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا ہے کہ اُس میں طرح طرح کے مضامین کی گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔ خواہ یہ مضامین تاریخی یا دیگر لحاظ سے قابلِ یقین ہوں یا نہ ہوں۔ وہ مثالیں نمونہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ رگوید کی قدامت ظاہر کرنے کے سلسلہ میں (The fountain Head of Religion) کے مصنف گنگا پرشاد لفظ Babylon کی تشریح اس طرح فرماتے ہیں:-

"یہ ایک مشہور شہر ہے جو کسی زمانے میں ایک بڑی سلطنت کا پایۂ تخت تھا اور دریائے فرات کے کنارے واقع ہے۔ لفظ بے بیلون ایک دوسرے لفظ بہوپلین سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک قوم تھی جو بہوپکہ مقام کی رہنے والی تھی اور جس نے غالباً ہندوستان سے ہجرت کر کے اس شہر کو (یعنی بے بی لون) کو آباد کیا۔"

اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ تاریخی زمانہ کے آغاز سے پہلے یعنی اب سے چھ سات ہزار سال پیشتر جو قومیں دریائے فرات کے کنارے آباد تھیں اُن کی اُس وقت کی زبان میں اس شہر کا نام "تن تر کی" تھا جس کا ترجمہ ہے "مقامِ حیات"۔

تھوڑے دنوں کے بعد اُسی زمانہ میں اُس کا دوسرا نام "کا دِمرّا" رکھا گیا جس کے معنے ہیں "خدا کا دروازہ" جب پُرانی قوموں کی بجائے (جن کو ترکی النسل کہا جاتا ہے) سامی اقوام نے تاریخی زمانہ کے آغاز میں یا اُس سے بھی قبل اُس شہر پر قبضہ کیا تو اپنی زبان میں اُس شہر کا نام "باب ایل" رکھا۔ نام کیا رکھا اُسی پُرانے نام کا ترجمہ سامی زبان میں کر دیا۔ یعنی خدا کا دروازہ" بعد کے زمانہ میں یہی لفظ اختصار کے ساتھ بابل قرار پایا۔ اور آج تک اُسی طور سے زبان زدِ خاص و عام ہے، البتہ یونانیوں نے جب اُس کو اپنی زبان میں لیا تو "بے بی لون" کر دیا اور جس ملک کا وہ دار السلطنت تھا اُس کا نام Babylonia قائم کر دیا۔

(ایل وہی کلمہ ہے جو الفاظ جبریل و میکائیل میں پایا جاتا ہے)

دوسری مثال رگوید کے ایک لفظ پنی کی ہے۔ اس لفظ کے معنی ایسے بخیل کے ہیں جو مال کو روک رکھتا ہے۔ دان نہیں کرتا ہے یا بے ایمانی اور زبردستی سے مال حاصل کرتا ہے۔ رگوید کے ایک بھجن میں پنی فضائی عفریتوں اور چور ڈاکوؤں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کے کالے کالے قلعوں (بادلوں) کو اندر اپنے ساتھیوں کی مدد سے مسمار کرتا ہے اور وہاں سے گائیں چھڑا لیتا ہے۔ پنیوں کا سردار "ول" کفِ افسوس ملکر رہ جاتا ہے۔ ایک صاحب نے جو ہندو ہسٹری کے مصنف ہیں اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ پنی ایک آریہ فرقہ تھا جس نے اپنے نام پر وہ ملک آباد کیا جس کو فنیشیا کہتے ہیں اور اندر نے جو ایک دوسرے آریہ گروہ کا سردار تھا اسی قوم فنیشیا پر حملہ کیا تھا۔ دلیل یہ قایم کی گئی ہے کہ فنیشیا لفظ پنی سے ماخوذ ہے۔ دیگر یہ کہ لفظ پنی کے معنی تجارت پیشہ کے ہیں اور اسی معنی میں ہر آریہ زبان میں مثلاً لاطینی زبان کے ذریعہ سے انگریزی کے لفظ Company میں یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ چونکہ اہلِ فنیشیا بھی تجارت پیشہ تھے اس لئے پنی اور فنیشیا ایک ہی چیز ہیں۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ انگریزی لفظ "فنیشیا" یونانی لفظ "فوائے نکس" (Phoenix) سے ماخوذ ہے اور اُس علاقہ کا نام ہے جہاں بحرِ روم کے کنارے فلسطین سے متصل بیروت اور صور واقع ہیں یہاں کنعانی نسل کی قومیں سن عیسوی سے تین چار ہزار برس پہلے آباد تھیں اور تجارت پیشہ تھیں۔ ان کا رنگ سرخی مائل تھا اور رنگوں کی تجارت بھی کرتی تھیں۔ یونانی زبان میں سرخ اور گلابی رنگ کو فوائے نوس (Phonos) کہتے ہیں۔ چنانچہ یونانیوں نے ان لوگوں کا نام فوائے نکس رکھدیا یعنی سُرخ رنگ والے اور یہی نام رائج ہوگیا مثلاً لاطینی زبان میں پینوس (Poenus) ہوگیا۔ ورنہ قدیم زمانہ میں یہ لوگ اپنے اپنے شہروں کے نام سے منسوب تھے۔

غرض کہ ایک طرف تو محققین فرنگ کے نتائجِ افکار ہیں اور دوسری طرف اقسام مندرجۂ بالا کی تاویلات کا دفتر۔ محققین مذکور اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ رگوید کی عبارت سمجھنے کے لئے تاریخ۔ مقامی روایت، و دستور وعقاید اور دیگر غیر مقامی مگر ہمعصر آریہ قوموں کی لٹریچر اور عقاید کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ تفاسیر اور کتب لغت کے متعلق یہ کیفیت پائی جاتی ہے کہ قدیم زمانہ میں یعنی سنہ عیسوی سے صرف تین چار سو برس پیشتر ایک مصنف "یسک" نامی نے رگ وید کی لغت مرتب کی تھی۔ بعد کے زمانہ میں اور کتابیں بھی مرتب ہوئیں۔ اہلِ تاویل یسک کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

محققین کے نزدیک ان قدیم و جدید مصنفین کی وقعت کم و بیش برابر ہے۔ کیونکہ یسک کا بھی وہ زمانہ ہے جب رگوید کی تصنیف کو سیکڑوں برس گزر چکے تھے اور رگویدی زبان کے الفاظ متروک و ناقابلِ فہم ہو چکے تھے علاوہ ازیں قدیم لغت اور تفاسیر بھی جدید مصنفین کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ اس لئے ان کی تشریح مطالب کو قطعی

طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - اس پر مستزاد محققین فرنگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یسک کی کتاب رگوید کے جملہ الفاظ پر حاوی نہیں اور نہ وہ خود کسی لفظ کے کوئی مخصوص معنی بیان کرتا ہے بلکہ اُس نے ایک ایک لفظ کے کئی کئی استدلال و قیاس کے تحت بیان کر دئے ہیں یعنی اُس نے موقع کے لحاظ سے کسی لفظ کے کوئی خاص معنی متعین نہیں کئے ہیں - اسی کے ساتھ صاحبان مذکور اس امر کو ناممکن قرار دیتے ہیں کہ رگوید کے بھجنوں کے مصنفین نے کسی ایک لفظ کو کئی کئی معنی میں یعنی کہیں ایک معنی میں اور کہیں دوسرے تیسرے معنی میں استعمال کیا ہے -

اس لئے یہ صاحبان اس نظریہ کو ناقابل قبول خیال کرتے ہیں کہ یسک نے کسی لفظ کے جو متعدد معنی بطریق احتمال بیان کئے ہوں اُن سب کو یا اہلِ تاویل نے محض لفظ کے مادہ کے اعتبار سے جو متعدد معنی تاریخ و روایت و قرائن وغیرہ کے خلاف بحوالۂ بیان یسک یا دیگر نہج پر قایم کئے ہوں صرف اُنھیں کو صحیح و درست سمجھا جائے -

اب اُن چند بھجنوں کے ترجمے پیش کئے جاتے ہیں جن سے مندرجہ بالا بحث متعلق ہے - "وِشوَکرمان" کے نام پر دسویں کتاب میں دو بھجن ہیں یہ نمبر ۸۱ و ۸۲ - سوکت ۸۱ کے سات بندوں میں سے تین بند نقل کئے جاتے ہیں موجودہ عقاید تثلیث میں 'وِشوَکرمان کو برہم سے تعبیر کیا جاتا ہے :

"وہ کیا جگہ تھی جس پر اُس نے پیر جمائے — ؟
کہاں اور کیسے اُس کو کوئی شئے سہارے کے لئے
دستیاب ہوئی ؟
جبکہ بصیر اور خالقِ ارض "وِشوَکرمان"
آسمانوں کو عالم ظہور میں لایا -"
"جس کی آنکھیں اور جس کا منھ ہر مقام پر ہے -
جس کے بازو اور پاؤں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں -
وہ ایک دیوتا جسنے زمین و آسمان پیدا کرتے وقت -
اپنے دونوں بازوؤں اور پروں سے اُنکو سنبھال رکھا ہے"
"ازراہ کرم بتائیے کہ وہ کیا لکڑی تھی اور وہ کیا درخت تھا -
جس سے اُنھوں نے زمین و آسمان کو بنایا -
اے عاقلو! اپنے دماغ میں تلاش کرو کہ -
جب اُس نے عالموں کو سہارا دیا تو وہ کس چیز
پر استادہ تھا - ؟"

سوکت نمبر ۸۲ کے مندرجہ ذیل انتخاب سے ظاہر ہوگا کہ پانی ہیں وہ ابتدائی تخم پیدا ہوا جس سے سب چیزیں دیوتا اور کائنات ظہور میں آئے :-

"وہ کون ہے جو ہمارا باپ - والدین اور ہمارا متصرف ہے -
جو سب بستیوں کو اور سب چیزوں کو جانتا ہے -
جو تنہا دیوتاؤں کے نام مقرر کرتا ہے -
اور جس کی طرف سب چیزیں متجسسانہ طریق پر
رجوع کرتی ہیں - ؟"
"وہ کیا ازلی تخم تھا جسکو ذخائرِ آب نے پرورش کیا -
اور جسمیں سب دیوتاؤں نے اپنے آپ کو اکٹھا دیکھا -
جو زمین سے پرے ہے اور آسمان سے پرے ہے -
اور جو ماورائے اُس مقام راز کے ہے جہاں مقتدر
دیوتا رہتے ہیں - ؟"

" ذخائرِ آب نے اُس ازلی تخم کو پرورش کیا -
جس میں سب دیوتا مجتمع ہوئے -
یعنی وہ ایک جو آفتاب کے ماخذ میں (یا آغوشِ آفریدہ میں) قایم ہے
اور جس کے اندر تمام عالم شامل ہیں "

" تم اُس کو نہیں معلوم کر سکتے جس نے یہ تمام
عالم پیدا کئے -
جو چیز تمھارے نزدیک پہونچتی ہے (تمھارے
ذہن میں آسکتی ہے) وہ کوئی دوسری ہی چیز ہے "

اسی سلسلہ کا ایک سوکت نمبر ۱۲۱ (کتاب دہم) ہے جو "ہرینہ گربھہ" کے نام سے منسوب ہے۔ اس کے چند بندوں کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے - اس مرکب لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، یعنی وہ گربھہ (رحم) جو 'ہرن' (طلا) سے پُر ہے - یا طلائی رحم - انگریزی میں بالعموم golden germ یا golden Child ترجمہ کیا گیا ہے تشبیہاً اس کی تعبیر طلوع ہونے والے آفتاب سے کی گئی ہے - رگویدی زمانہ کے بعد سے آج تک اُس کو "وشنو" مانا گیا ہے - یہ وہی وشنو ہے جو رگوید میں آفتاب کی نمایندگی کرتا ہے اور موجودہ تثلیث کا دوسرا عنصر ہے :-

بند - ۱

" ابتدا میں ہرن یہ گربھہ عالمِ وجود میں آیا -
جو تنہا کل موجودات کا آفریدہ مالک تھا -
اُس نے زمین و آسمان کو قایم کیا -
وہ کونسا دیوتا ہے جس کو ہم نذر و نیاز چڑھائیں ؟
(پوجا اور قربانی کریں)

بند - ۲

وہ جو نفس (زندگی) اور قوت عطا کرتا ہے -
جس کے احکام کی سب دیوتا عزت کرتے ہیں
جس کا سایہ بقا اور موت ہے -
وہ کونسا دیوتا ہے جسکو ہم اپنی نذر و نیاز چڑھائیں - ؟

بند - ۳

وہ جو اپنی عظمت سے تنفس اور بیدار ہونے والی
دنیا کا تنہا بادشاہ ہے -
وہ جو انسان اور حیوان پر حکومت کرتا ہے -
وہ کونسا دیوتا ہے - الخ ؟

بند - ۷

جب سیلِ آب تخم کو لئے ہوئے -
اور اگنی کو پیدا کرتے ہوئے تمام عالم پر چھا گیا -
اُسوقت وہ نمودار ہوا جو دیوتاؤں کا تنہا مایۂ حیات ہے -
وہ کونسا دیوتا ہے - الخ

بند - ۸

وہ جسنے اپنی طاقت سے ذخائرِ آب پر نظر ڈالی -
جنھوں نے قوت کو پیدا کیا اور قربانی کو روشن کیا -
وہ جو سب دیوتاؤں کے اوپر اکیلا ایک دیوتا ہے -
وہ کونسا دیوتا ہے - الخ

بند - ۹

(دعا ہے کہ) وہ خالقِ ارض ہم کو مضرت نہ پہونچائے -
وہ جو مقررہ قوانین کے ذریعہ سے حکومت کرتا ہے -
جس نے آسمان پیدا کیا اور جسنے چمکیلے اور طاقتور
ذخائرِ آب پیدا کئے -
وہ کونسا دیوتا ہے - الخ

نظم مندرجۂ بالا کے متعلق دو باتیں قابلِ توضیح ہیں۔ پہلی یہ کہ اس نظم میں دیوتاؤں کے وجود کو قایم رکھتے ہوئے ایک نامعلوم ذات واحد کے بھی خالق و مالک کی حیثیت سے موجود ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے اور اُس صورت میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ کس دیوتا کی پرستش کی جائے۔ اس سوال کا جواب اسی نظم کے دسویں بند میں یہ دیا گیا ہے کہ وہ نامعلوم دیوتا "پرجاپتی" ہے۔ لیکن اس بند کا رگوید کے اور نظم مذکورہ کی تصنیف کے زمانہ کے کچھ عرصہ بعد یعنی برہمنڑوں کے زمانہ میں اضافہ ہونا پایا جاتا ہے۔ دوسری بات ایک لفظ کے معنی سے متعلق ہے اس نظم کے بندوں میں جو چوتھا مصرعہ بطریق استفہام ہے اُس میں ایک لفظ "کا" مستعمل ہوا ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جو اردو میں "کیا" اور ہندی میں "کاگئے" ہے۔ انھیں لفظوں کے معنی میں لفظ مذکور یعنی لفظ 'کا' اس نظم میں اور دیگر مقامات پر رگوید میں استعمال کیا گیا ہے اور اسی معنی کے اعتبار سے رگوید کے بعد کے زمانہ میں سوال کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ دیوتا جو متصف یا وصاف مذکور ہے اور قابل پرستش ہے وہ "پرجاپتی" ہے۔ اگر لفظ "کا" معمولی کلمۂ استفہام نہ ہوتا تو جواب کی یا مزید تاویل کی ضرورت نہ ہوتی۔ مزید تاویل کی کیفیت یہ ہے کہ اُس زمانہ کے بھی بعد جب سوال کے جواب میں "پرجاپتی" کا نام قایم کیا گیا تو لفظ "کا" اور اُس کے معنی ہی کو بدل دیا گیا۔ یعنی یہ قرار دیا گیا کہ لفظ "کا" کلمۂ استفہام نہیں بلکہ ایک جداگانہ مستقل لفظ ہے اور یہ کہ اُس کے معنی خدا ہیں۔ اُسکے بعد تاویلِ مزید نے یہ مفہوم پیدا کیا کہ لفظ "کا" خلاقِ اکبر کا اسمِ ذات ہے جس طرح عربی زبان میں خدا کا اسم ذات اللہ ہے۔ اس طرح نظم مذکور میں جس ٹیپ کے مصرعہ کا یہ ترجمہ خود قدیم و جدید اہل ہند کرتے ہیں کہ کس خدا کی پرستش کرنا چاہئے اہل تاویل اُس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ اللہ کی پرستش کرنا چاہئے۔ محققین فرنگ اس تاویل کو غلط قرار دیتے ہیں اور لفظ مذکور کے معنی میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ تدریجی تبدیلیاں ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

تخلیقِ کائنات سے متعلق بقیہ نظموں میں سے دو میں فلسفہ کے ڈھنگ پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ "ست" (وجود) کا "اَست" (عدم) سے ارتقا ہوا ہے لیکن اُسی کے ساتھ یہ مفہوم بھی قایم ہے کہ کائنات خلق ہوئی ہے اور یہ کہ تخلیق کے تین درجات اس طور سے واقع ہوئے ہیں کہ پہلے دنیا پیدا ہوئی۔ پھر دیوتا وجود میں آئے اور اخیر میں آفتاب۔ ایک بند کا ترجمہ پیش ہے (سوکت ۷۲۔ منڈل دہم):—

"پرجاپتی نے کاریگر کی طرح۔
اِس عالم کو گھڑا۔
دیوتاؤں کے ابتدائی زمانہ میں۔
"لاشے" سے "شے" وجود میں آئی۔"

اب اس سلسلہ کی نظموں کا بہترین اور آخری نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس کا نام تخلیق کا گیت رکھا گیا ہے۔

(سوکت ۱۲۹ - منڈل دہم) - ترجمہ ملاحظہ ہو :-

بند - ۱

"اُسوقت عدم تھا اور نہ وجود -
نہ عالمِ باد اور نہ آسمان جو اُس سے پرے ہے -
کیا چیز سب کے محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قایم تھا ؟
کیا وہ پانی اور عمق بے پایاں تھا - ؟

۲

"اُسوقت فنا و بقا کا کوئی وجود نہ تھا -
اور نہ دن رات کا کوئی فرق تھا -
"وہ ایک" اپنے آپ میں بغیر سانس یا ہوا کے سانس لے رہا تھا -
اور اُسکے سوا کوئی دوسری شئے نہ تھی -"

۳

ابتدا میں تاریکی پر تاریکی چڑھی ہوئی تھی -
سب کچھ (کائنات) غیر متمیز صورتیں پانی ہی پانی تھا -
"وہ ایک" جو خلد میں جامۂ عدم پہنے ہوئے تھا -
حرارت نے اُس کو اپنی طاقت سے پیدا کیا - "

۴

"اُس میں ابتدائے خواہش نمودار ہوئی -
یہ خواہش عقل (یا روح) کا ابتدائی تخم تھی -
جس کو رشیوں نے اپنے دل و دماغ کی کاوش
سے معلوم کیا -
کہ وہ (تخم) عدم و وجود میں واسطۂ اتصال ہے -"

بند - ۵

"وہ شعاعِ نور جو عالموں میں پھیلی -
کیا وہ عالمِ پستی سے نمودار ہوئی یا عالمِ بالا سے ؟
پھر بیج بوئے گئے اور قوتیں پیدا ہوئیں -
کارخانۂ قدرت عالمِ پستی میں اور اقتدار و ارادہ
عالمِ بالا میں -"

۶

"حقیقت کی کس کو خبر ہے - ؟ یہاں اُسکا اعلان
کون کر سکتا ہے - ؟
کائنات (یا عالمِ مخلوقات) کی پیدائش کہاں سے
یا کس سے ہوئی - ؟
کیا دیوتا بھی اُس کے ساتھ ظہور میں آئے - ؟
(یا دیوتا بھی بعد کی پیدائش ہیں) -
تو پھر کون جانتا ہے کہ وہ (کائنات) کہاں سے
نمودار ہوئی - ؟"

۷

"یہ عالمِ مخلوقات کہاں سے نمودار ہوا - ؟
یا یہ کہ وہ خلق بھی ہوا ہے یا نہیں ؟
وہ جو بالاترین آسمان سے سب کچھ دیکھتا ہے -
اس (حقیقت) کا علم صرف اُسی کو ہے - یا شاید
وہ بھی نہیں جانتا -"

نظم ہائے مذکورہ میں اختلافِ مضامین و خیالات کے باوجود اُن سے جو مربوط نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے عدم تھا - اُس سے وجود کا ارتقاء ہوا - وجود پانی کی شکل میں نمودار ہوا - (نوٹ :- نظموں میں پانی بصیغۂ جمع

استعمال ہوا ہے۔ اُس کا ترجمہ سیلِ آب یا ذخائرِ آب کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔)۔ پانی سے وہ "ایک" خلق ہوا جس کو بالعموم تخم کہا گیا ہے اور ایک نظم میں "ہرنیہ گربھ" اُس کا لقب قرار دیا گیا ہے۔ ابتداءً وہ "ایک" بے حس و حرکت نامعلوم شے تھی لیکن بعد میں اُس میں خواہش کے نتیجہ میں کائنات کا ظہور ہوا۔ یہ وہی "ایک" ہے جو ان نظموں کے مطابق خود آفریدہ یعنی مخلوق ہے اور خالق و صانعِ عالم بھی ہے۔ اور جس کی نسبت ایک نظم میں یہ کہا گیا ہے کہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا کہ ظہورِ کائنات کیونکر ہوا۔

یہ ہے فلسفیانہ وحدانیت کا رنگ جو رگوید کے اخیر زمانہ یا اُس کے بعد کے کسی قریب زمانہ میں عام عقاید پر چڑھا عقائد مذکور پر اگر ارتقائی پہلو سے نظر ڈالی جائے تو باعتبار مضامین رگوید کیفیت کم و بیش ذیل کے مطابق پائی جائے گی۔

رگوید میں تین کا عدد ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دیوتاؤں کی تعداد تین مرتبہ گیارہ ہے۔ کائنات تین عالموں پر مشتمل ہے۔ عالمہائے سماوی۔ فضائی و ارضی۔ اِن تینوں عالموں میں کارفرما تین اہم ہستیاں ہیں۔ دیَو وَس۔ اِندر۔ اگنی۔ جب دیَو وَس، نظر سے گرتا ہے تو وَرُن، اُس کا قایم مقام ہوتا ہے۔ جب اندر کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو اُس کی جگہ "رُودر" کو ملتی ہے اور تثلیث اس طرح قایم ہوتی ہے:۔ وَرُن۔ رُودر۔ اگنی۔

چونکہ اگنی جامع الصفات ہے اس لئے مجموعی حیثیت سے وہ "وَرُن" (آسمان و آفتاب) اور "رودر" (برق و رعد) کی بھی برنگِ وحدانیت نمایندگی کرتا ہے۔ اور ازلی بیضہ (بیج) یا ہرنیہ گربھ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہاں تک رگویدی تخیل پہنچکر ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس تخیل میں تثلیث کا عنصر داخل و شامل رہتا ہے اس لئے بعد کے زمانہ میں بھی پھر وہی تثلیث بہ تبدیلِ ہیئت برہما۔ وشنو اور شِو کی شکل میں قایم ہو جاتی ہے۔ یہ ہے موجودہ تثلیث۔ گو اس میں اور سابقہ تثلیث میں ناموں کا فرق ہے لیکن یہ مغایرت صرف ظاہری ہے۔ پہلے شِو لقب تھا رُودر کا۔ اب بجائے خود وہ نام ہو گیا ہے۔ وِشنو بھی وَرُن کی طرح آفتاب کی نمایندگی کرتا تھا۔ اور اگنی جس طرح سب دیوتاؤں کی اور کائنات کی روحِ رواں تھا اور خود ہی پوجا اور خود ہی پجاری تھا وہی معنی برہما کی ذات میں پنہاں ہیں۔ اہلِ تاویل اِن سب ناموں کو خدا کا مترادف قرار دیتے ہیں۔

تین کے عدد کے متعلق ایک دلچسپ روایت دیکھنے میں آئی ہے۔ دبستانِ مذاہب میں جو شاید جہانگیری عہد کی تصنیف ہے ہندوؤں کے ایک مذہبی فرقہ "چارواکی" کے ذکر کے سلسلہ میں اُس فرقہ کے لوگوں کا ایک عقیدہ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

"چون ہندوان از برہما و بشن و مہادیو کہ ہر سہ فرشتۂ عظیم الشان سازندہ و دارندہ و برندۂ جہان اند نقل کنند (اہلِ فرقہ) جواب دہند کہ آں عبارت از ذکر و خصیتین ست۔ چوں ہندوان گویند کہ بشن چہار دست دارد

گویند در حینِ مباشرت بازن - ہر مرد و زنے ایں حال دارد - چوں ستایشِ مہادیو کنند کہ از سرِ او رود گنگ رواں شدہ - گویند آں ذکر ست در حینِ بول وانزال - چوں از برہما گویند کہ خالقِ اشیاست - جواب گویند کہ آں اشارہ بہ بچہ داں است۔"

فرقۂ مذکور ویدی یا براہمنی مذہبوں کا - نیز ویدانت فلسفہ کا قائل نہ تھا - اقتباس سے کم از کم اسقدر ظاہر ہوتا ہے کہ اس عدد کو پیدایش کی وجہ ظاہری سے کچھ نہ کچھ نسبت ہے - اس کھلے کھلے اور فحش مضمون کے مقابلہ میں اس زمانہ کے ایک محقق اور ماہر علوم ہندسہ (مسٹر سی - کے - آگڈن) نے اعداد کی مورخانہ تحقیقات کے سلسلہ میں تین کے عدد کے متعلق اپنی کتاب Mathematics for the million مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں لکھا ہے کہ :-

"تین کے عدد کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا تعلق مرد کے جنسی عضو سے ہے - بہت سی زبانوں میں تین کے عدد کو مردمی کی علامت طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔"

سر جان مارشل اپنی کتاب Mohenjo-daro and the Indus Civilization میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"اس وقت بھی ہندوستان میں شیو اور وشنو کی پرستش انسان کی صورت میں کی جاتی ہے، اور اول الذکر کی علامت لنگ (مردانہ جنسی عضو) اور دوسرے کی سالگرام ہے -

موہنجوڈاڑو کے کھنڈروں میں بھی یہ چیزیں دریافت ہوئی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے ہی یہاں جنسی اعضا کی پرستش کا رواج پایا جاتا تھا۔"

اقتباسات بالا سے ظاہر ہوگا کہ تثلیث کا خیال قدیم الایام سے انسانی خیالات اور عقائد کا بنیادی عنصر رہا ہے اور یہ محض اس وجہ سے کہ انسان اپنے دماغ کو پیدائش حیوانی کے اسباب ظاہری کے تصور پاک صاف نہ کرسکا - اب بھی اگر کسی ایسے شخص سے سابقہ پڑ جائے جو تین کے عدد کی اہمیت کا قایل ہو تو مذہبی عقاید تو درکنار وہ یہ بتا سکے گا کہ دنیا کی ہر چیز تثلیث پر مبنی ہے - معاملات میں ثبوت و تردید و تصفیہ - منطق میں کبرے صغرا و نتیجہ - نفسیات میں حس - جذبہ اور ارادہ - زمانہ کے اعتبار سے گزشتہ و حال و آیندہ - زبان میں اسم فعل - حرف - صنعت میں کاریگر - آلاتِ کاریگری اور سامان - یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر سے کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق کائنات میں بھی تین اصول ہی کارفرما ہوں گے - یعنی پرتھوی (جس کے مہادیوی وغیرہ متعدد نام ہیں) ماں کے طور پر - دیوس - ورن - رودر - شیو - یکے بعد دیگرے باپ کی جگہ اور تیسرا اگنیس دونوں کی آمیزش کا واسطہ - دوسری بات جو اقتباسات مذکور سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اقوام آریہ کے ہندوستان میں

وارد ہونے سے پہلے ہندوستان کے قدیم باشندوں میں عورت و مرد کے اعضائے تناسل کی پرستش تصویریں کھینچکر اور پتھر اور دھات کی مورتیں بناکر کی جاتی تھی۔ جب آمدیہ فرقے اُن میں مدغم ہوگئے تو عقاید بھی مخلوط ہوگئے اور اُنھیں اشیا کی پرستش اُسوقت سے آج تک تمام ہندوستان میں مہادیوجی (شیو) کے لِنگ اور پاروتی جی کی یُونی، (بچہ دان و عضو مخصوص) کے ناموں سے مندروں میں اور خانہ بخانہ جاری ہے جس سے 'چارواکی' فرقے کی دلایل کی تائید ہوتی ہے۔

آفرینشِ عالم کے مسئلہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ابتدائی مفہوم تخلیق کا یہ تھا کہ دُنیا ایسے پیدا ہوئی جیسے کوئی حیوان بچہ جنتا ہے۔ اس لئے جہاں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ 'دیَو وس' یا کسی اور دیوتا نے عالم کو پیدا کیا تو پیدائش کے یہی معنی ہوتے تھے۔ خیالات جب ترقی پذیر ہوئے تو تخلیق کا یہ مفہوم ہوا کہ فرداً فرداً کسی خاص دیوتا نے یا مجموعی حیثیت سے دیوتاؤں نے دُنیا کو اس طرح بنایا جیسے کوئی کاریگر کوئی چیز بناتا ہے۔ جب دماغی ترقی نے قدم اور آگے بڑھایا اور مجموعی حیثیت سے وشو دیوتا اور انفرادی حیثیت سے کوئی ایک شخصیت مثلاً اگنی کارفرمائے عالم تصور کی گئی تو اُسی کے ساتھ ارتقائی پہلو پیش نظر آیا۔ لیکن ارتقا اور تخلیق کے مفہوم مخلوط رہے اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکے۔ یہ کیفیت متعدد اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی اور اسوقت تک جاری ہے۔ اس کی تفصیل برہمنڑوں کے ذکر میں پائی جائے گی۔ سردست اس قدر بیان کافی ہوگا کہ اہلِ ہند کے مذہب کی ہزاروں شاخیں ہیں اور ہر شاخ میں خالق۔ تخلیق اور ارتقا کا مفہوم مخلوط طریقہ پر جدا جدا ہے۔

انسان کی آیندہ زندگی کے متعلق رگویدی عقیدہ اس طور پر بیان کیا جاچکا ہے کہ مرنے کے بعد روحیں 'یَم' کی خدمت میں پہونچکر عیش و آرام سے رہتی ہیں۔ اُن کی آیندہ ضروریات کے لئے مرنے کے وقت آسایش کی کل چیزیں مہیا کی جاتی تھیں۔ مثلاً عورت، زیور، ہتھیار، گھوڑا، رتھ، مویشی وغیرہ۔ وہی طریقہ اب تک چلا آتا ہے اور اہلِ مقدرت اب بھی یہ سب چیزیں دان کرتے ہیں ماسوائے عورت کے جس کا ستی ہونا اب رواجاً یا حکماً مسدود ہے۔ تناسخ کا مسئلہ بعد کی ایجاد معلوم ہوتا ہے اور بظاہر اُن تمام رسوم کے منافی ہے جن میں 'شرادہ' کے موقعہ پر پُرکھوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور کسی عزیز کی وفات پر گائے، زیور، وغیرہ وغیرہ کا حسب مقدرت دان کیا جاتا ہے۔

ا - ح

نقشہائے رنگ رنگ ہم توقیت ۸ ر
ریاض نمبر بجائے ایک روپیہ صرف ۸ ر کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے

مذہب اور فلسفۂ مذہب
دونوں معہ محصول
دو روپیہ میں

مکتوبات نیاز

قبلۂ مستمنداں - رات اور زلف کا افسانہ تو نہیں، لیکن کہانی بڑی ضرور ہے۔ سناؤں گا کسی وقت اگر زمانہ نے فرصت دی، لیکن آپ نے جس لطف و کرم سے کام لیا ہے اور اس باب میں جتنی تکلیف اٹھائی ہے اس کا اعتراف تو اسی وقت ضروری ہے، گو جذبات کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے الفاظ کی کوتاہی مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنے دے گی:

گر غبار آلودہ گشتی باک نیست
اے ہزاراں دیدہ در راہِ تو خاک

اس میں شک نہیں کہ آپ نے جس خلوص و صداقت سے کام لیا ہے، وہ اس زمانہ کی چیز ہے جو گزر گیا اور جس کے اب صرف افسانے سننے میں آتے ہیں۔ لیلیٰ کا دامن اور مجنوں کا ہاتھ - یہ تو کوئی عجیب بات نہیں، "روئے محمود و خاک پائے ایاز!" - البتہ حیرت کی چیز ہے - زندہ رہئے، خوش رہئے۔

لاحول ولا قوہ — ! - تم بھی عجیب چیز ہو - اگر خلوت تک رسائی نہیں تو نہ سہی: -

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم ست

چونکہ تم مردِ تقدیر ہو، مردِ تدبیر نہیں، اس لئے تم صرف مدعا کو جانتے ہو، حصول مدعا کی راہوں کو نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تم مومن ہو اور دُنیا کا حُسن و جمال تو وہاں مومن ہی کے لئے وقف ہو گا، لیکن یہ تو غور کرو کہ دنیا میں تنہا تم ہی ایک مومن نہیں، مومن کانفرنس ہی کے لاکھوں افراد تمہارے رقیب نکل آئیں گے، اس لئے یہ کیا ضرور ہے کہ جو چیز تم کو پسند ہے وہ کسی اور کو پسند نہ آئے اور اگر اس تقسیم میں مرضی کو بھی دخل ہوا، تو چلئے چھٹی ہوئی، داڑھی تم منڈاؤ گے نہیں اور داڑھی والوں میں تمہاری "زنخ پوش" داڑھی کو کون پوچھے گا۔

بے وقوف ہوئے ہو۔ گھر میں چین سے بیٹھو، نماز کے پابند پہلے ہی سے ہو، رمضان آرہا ہے، اوراد و وظائف اور بڑھا دو - رندی بڑی مشکل چیز ہے، یہاں تو شراب کی جگہ شراب ہی چاہئے - یہ نہیں

کہ پانی نہ ملا تو تیمم کر لیا۔

اگر تمھاری رسائی وہاں "نظارۂ بعید" کی حد تک بھی ہے، تو غنیمت جانو، "خلوتیانِ راز" میں شامل ہونے کی اہلیت نہ تم میں کبھی تھی نہ ہوگی۔ رہی تمھاری مایوسی سو اس کی ایک تاویل بیدلؔ نے بڑی معقول کی ہے:

گل بہ سرداریم تا دستے بہ سردا ریم ما

اپنا سر، کسی اور کا نہیں ــــ یعنی اگر دیوار سے سر ٹکرانے کا حوصلہ نہیں تو سر پکڑ کر گھر ہی میں بیٹھا رہنا بھی کم فخر کی بات نہیں۔

محبت نامہ کا شکریہ۔ آپ نے جس انداز سے دل پرسی کی ہے، اس کے جواب میں داستانِ غم سُنانے کا موقعہ ہی کیا ہے۔ سعدیؔ کا یہ شعر تو آپ نے سنا ہوگا:۔

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میرؔ نے بھی غالباً سعدیؔ کے اسی شعر سے متاثر ہو کر، کہا ہے!۔

یہ کہتے وہ کہتے، تھا دل میں جو یار آتا
کہنے کی ہیں سب باتیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

یہ نہ شاعری ہے نہ تصنع، بلکہ یکسر اظہارِ حقیقت ہے کہ اگر آپ ایسے بعض مخلص احباب کا وجود نہ ہوتا، تو میں کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ بہرحال اس وقت تک تو محض زندہ تھا، لیکن آپ نے پرسشِ حال کی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اب خوش بھی ہوں۔

اے گردِ راہ تو بہ جہاں نو بہار من !

بندہ نواز ــ میں جانتا ہوں کہ مجھے آپ سب کچھ دے سکتے ہیں اور وہ کیا ہے جو نہیں دے سکتے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ، فقیر ہمیشہ فقیر ہی رہتا ہے۔

گدا، اگر ہمہ عالم بہ او دہند، گدا است

اس لئے نہیں کہ خالی دامن کبھی پُر نہیں ہو سکتا، بلکہ محض اس لئے کہ "تہی دامنی" بجائے خود بڑی دولت ہے آپ واقف نہیں اور خدا نہ کرے کبھی ہوں کہ:۔

بیفشاں دامن و آزادہ برخیز

کیا چیز ہے، لیکن جن کا مسلک یہ ہے، اُن سے رسم و راہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ آپ انھیں کبھی گرویدۂ احسان بنانے کی کوشش نہ کریں۔

جاہ ز علم بے خبر، علم زجاہ بے نیاز
ہم محکِ تو نہ دید، ہم رزِ من محک نہ خواست

کرم گسترا — یقیناً آپ کو میرے "خلوت آرمیدگی" پہ رحم آتا ہوگا، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ:

یوسفے ہست دریں گوشۂ زنداں مارا

رات دن میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ کسی کی تصویر میرے سامنے نہ رہتی ہو۔ اور غم کی اس لذت کو میں کسی قیمت پر ہاتھ سے دینے کے لئے طیار نہیں۔

می سوزم و از سوختن خود خبرم نیست

نہ میرے دل بہلانے کی کوشش کیجئے اور نہ کسی "خوشدلی" کی یاد دلایئے، اس خیال سے بھی میرا سینہ شق ہونے لگتا ہے۔

خاک ایسی زندگی پہ وہ کہیں اور ہم کہیں!

اس میں شک نہیں، سلطان اولیا محبوب الٰہی کا دربار، بڑا دربار ہے۔ جب میں دہلی میں تھا تو اکثر وہاں حاضری دیا کرتا تھا، لیکن میرا وقت زیادہ تر امیر خسروؔ ہی کے پائیں میں گزرتا تھا یا پھر وہاں سے ہٹ کر غالبؔ کے مزار پر۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا اور اس دوران میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو مجھ سے زیادہ خسروؔ کا عاشق تھا۔

جاڑوں کا موسم تھا اور مغرب کا وقت — چراغ ابھی روشن نہ ہوئے تھے اور لوگ نماز مغرب کی طیاریاں کر رہے تھے۔ حسب معمول رخصت ہوتے وقت جب پھر خسروؔ کے حضور میں حاضر ہوا تو دیکھا ایک خستہ حال نوجوان مزار کے پائیں بیٹھا ہوا ان کی یہ غزل گنگنا رہا ہے:

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند   ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

اور روتا جاتا ہے۔ میں بھی اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اشک آلود ہو گیا اور منتظر رہا کہ یہ اپنی غزل خوانی و اشک افشانی ختم کرے تو اس سے کچھ باتیں کروں۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے تمام آنسو بہا چکا تو میں نے آگے بڑھ کر اس سے خطاب کرنا چاہا، لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مالہٗ وما علیہ

ماہر القادری اور سیماب

جون کے رسالۂ شاعر میں جناب ماہر القادری کی ایک غزل شایع ہوئی ہے:

دلِ امیدوار کا عالم
کچھ خزاں کچھ بہار کا عالم

دل گرفتہ خمار کا عالم
وہ نشے کے اُتار کا عالم

لبِ شیریں پہ گنگناہٹ سی
نغمۂ آبشار کا عالم

اللہ اللہ! وہ مستئ رفتار
لغزشِ مے گسار کا عالم

اُسکے وعدوں کی دھوپ چھاؤں نہ پوچھ
جیسے لیل و نہار کا عالم

چھین کر دل کو وہ گریز و فرار
اک رمیدہ شکار کا عالم

وہ تبسّم، وہ چہرۂ شاداب
گلستاں کے نکھار کا عالم

رقصِ سیماب و موج و برق و شرار
یا دلِ بے قرار کا عالم

اول اول وہ گفتگوئے دراز
اور پھر اختصار کا عالم

میری تقدیر بن گیا ماہر
گردشِ روزگار کا عالم

غزل کی غزل "نظری غرد" کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جو معیاری حیثیت رکھتا ہو۔ ماہر صاحب کے بعض اشعار میں کافی جان ہوتی ہے، لیکن یہ غزل معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے عالم میں لکھی گئی ہے، جو صحیح شاعرانہ تاثرات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "دل گرفتہ خمار" بے معنی ترکیب ہے۔ خمار کو دل گرفتہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ علاوہ اس کے خمار اور نشہ کا اُتار دونوں ایک ہی چیز ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ "خمار کا عالم ایسا ہے جیسے نشہ کے اُتار کا" بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم یوں کہیں کہ "خمار کا عالم ایسا ہے جیسے خمار کا"

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے "دلگرفتہ خمار" کی ترکیب کے نقص کو نظرانداز کر دیں، تو بھی بالکل بے محل ہے کیونکہ خمار کی نوعیت خواہ وہ دلگرفتہ ہو یا غیر دلگرفتہ ایک ہی سی ہوتی ہے۔

دوسرے مصرعہ میں وہ کے استعمال کا کوئی موقعہ نہیں۔ یہ دراصل ہے کی جگہ لایا گیا ہے۔

لفظ نشہ پر ماہر صاحب نے ایک نوٹ کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے کہ "میں نے اس لفظ کے استعمال میں علامۂ اقبال کی پیروی کی ہے"۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس نوٹ کی کیا ضرورت تھی، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اردو میں نشہ اور نشّا، دونوں درست ہیں۔ ذوق کا شعر ہے:۔

رات میخانہ میں ساقی جو نشہ میں بہکا خسِ شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب

معروف کہتے ہیں:۔

جامہ سے بوئے گل کی طرح ہم نکل چلے اے بیخودی یہ میرے نشہ کی ترنگ ہے

فارسی میں البتہ "نشّا" ہی لکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ نشّا ہی کو صحیح سمجھتے ہیں تو اس طرح لکھ سکتے تھے۔

"نشۂ کے وہ اُتار کا عالم"

تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "گنگناہٹ سی" لکھا گیا ہے، یعنی کھلی ہوئی گنگناہٹ بھی نہیں اور دوسرے مصرعہ میں اس کو تشبیہ دی ہے "نغمۂ آبشار" سے جو بہت تیز و تند ہوتا ہے۔

چوتھے شعر میں یہ ظاہر کرنا چاہئے تھا کہ کس کی "مستی رفتار" کا ذکر ہے، لیکن اگر اس سے محبوب کی مستی رفتار متبادر ہے تو پھر اس کو "لغزشِ میگسار" سے تشبیہ دینا تنزل ہے نہ کہ ترقی۔ کیونکہ مستی و لغزش میں فرق ہے، اور رفتار کی خوبی یہی ہے کہ اس میں مستی پائی جائے نہ کہ شرابی کی لڑکھڑاہٹ"۔

پانچویں شعر میں "وعدوں کی دھوپ چھاؤں" بالکل بے معنی سی بات ہے۔ "دھوپ چھاؤں" ایک باریک ریشمی کپڑا ہے جس میں سایہ سے پڑتے نظر آتے ہیں، اور اسی معنے میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ میر انیس لکھتے ہیں:۔

تھا فرش ہر شجر کے تلے دھوپ چھاؤں کا

ماہر صاحب نے اس لفظ کا استعمال "نا استواری" کے مفہوم میں کیا ہے، جو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

چھٹے شعر میں کہیں ظاہر تو نہیں کیا گیا، لیکن ذکر محبوب ہی کی "گریز و فرار" کا ہے جو دل چھیننے کے بعد ایسا بھاگا جیسے شکار، شکاری کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے یہ شعر جتنا پست ہے ظاہر ہے۔

نویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہ لحاظ مفہوم ناقص ہے۔ جب تک یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ اختصار کا عالم کیا اور کیسا تھا، مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ شعر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ پہلے وہ دیر تک باتیں کیا کرتے تھے، لیکن بعد کو مختصر باتیں کرنے لگے۔ اس لئے دوسرے مصرعہ میں ردیف بالکل بیکار ہے اور اس سے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

مقطع میں بھی ردیف بیکار ہے۔ مفہوم صرف یہ ہے کہ "گردش روزگار" میری تقدیر بن گئی"۔ گردش روزگار کا عالم تقدیر نہیں بن سکتا۔

حضرت سیماب اکبر آبادی

شاعر کی اسی اشاعت میں جناب سیماب کی ایک نظم افکار پریشاں کے عنوان سے شایع ہوئی ہے جس میں قومی و ملی جذبات سے کام لیا گیا ہے اور موجودہ ہنگاموں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ نظم جوش و ولولہ سے خالی ہے لیکن حقیقت نگاری سے نہیں، اس لئے اگر وہ ہمیں کسی عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی، تو غور و فکر کی طرف ضرور مایل کر سکتی ہے۔

اس نظم میں جناب سیماب سے ایک بہت نازیبا سہو ہوا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:۔

ماند کر سکتی ہیں تاروں کو شعاعیں مہر کی
اکثریت، اقلیت کو ہضم کر سکتی نہیں

معنوی نقص تو یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں جو دعویٰ غالباً (بہ صورت استفہام انکاری) کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں، کیونکہ مہر کی شعاعیں یقیناً تاروں کو ماند کر دیتی ہیں اور لفظی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے "اقلیت" بروزن "عقلیت" استعمال کیا ہے، حالانکہ اسے بروزن "مصاحبت" ہونا چاہئے تھا۔

لفظ اقل بہ تشدید لام صفت ہے اور جب یت ملا کر اس کو اسم بنایا جائے گا تو لام کی تشدید کو بدستور قایم رکھا جائے گا، لیکن سیماب صاحب نے صرف یہی نہیں کیا کہ لام کی تشدید کو حذف کر دیا بلکہ قاف کے فتحہ کو بھی ختم کر کے بجائے اَقَلّ کے اَقْل (بہ سکون قاف) نظم کیا۔

میں اسے سیماب صاحب کی سہو پر محمول کرتا ہوں۔ ورنہ یہ ایسی غلطی نہ تھی جسے وہ نہ سمجھ سکتے۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔
معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ ادھ پا بھر بھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی تا سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے افراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔
قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)
(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے، میری ۲۸ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔
پتہ:۔ حکیم ثابت علی نیچ زبان، خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر ۳۰ لکھنؤ۔ یو۔ پی

باب المراسلۃ والمناظرہ

انجمن ترقی اُردو

مکرم بندہ - تسلیم -

ماہ جولائی کے نگار میں مولوی محمد امین صاحب زبیری کے خط پر جو آپ نے اپنی رائے ظاہر کی ہے اس سے میں بالکل متفق ہوں - افسوس اس بات کا ہے کہ انجمن برسوں سے کتابوں کا کاروبار کر رہی ہے لیکن وہ اس قابل نہیں ہوسکی کہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکے -

ہمارے پاس باہر سے انجمن کی کتابوں کی جو فرمائشیں آتی ہیں ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے میں جو دشواریاں ہمیں پیش آتی ہیں وہ تاجر کتب ہی جانتے ہیں، ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان فرمائشوں کی تعمیل نہ کریں - انجمن نے اپنا سول ایجنٹ ایک ایسے ادارہ کو بنا رکھا ہے جس سے انجمن کی ترقی یا اس کی کتابوں کی اشاعت میں کوئی مدد نہیں مل سکتی اور یہ ادارہ تاجر کتب کو اس قدر کم کمیشن دیتا ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی ناشر اتنی کم کمیشن نہیں دیتا - ڈاکٹر اقبال کی کتابوں پر جو بے انتہا مقبول کتابیں ہیں اس سے زیادہ کمیشن ملجاتا ہے -

اس کے علاوہ انجمن کے افراد کی حالت یہ ہے کہ وہ انجمن سے شایع ہونے والے تین پرچوں کی ذمہ داری بھی نہ سنبھال سکے اور یہ پرچے "ہماری زبان" "اُردو" اور "معاشیات" ایک دوسرے ادارہ کے سپرد کر دئے گئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو انجمن کا مستقبل ضرور تباہ ہو کر رہے گا، جو اُردو داں طبقہ کے لئے یقیناً نزول قیامت کے حادثہ سے کسی طرح کم نہ ہوگا یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کوتاہیاں ہیں جن کے متعلق میں نے ایک خط ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا لیکن افسوس آج کئی ماہ ہوگئے ہیں اس کا جواب نہیں آیا ہے ـــــ میں امید کرتا ہوں کہ مسلمان اس قومی ادارہ کی بہبودی کے لئے جلد متوجہ ہوں گے -

اُردو کا خادم "ایک ناشر" از دہلی

(نگار) یہ خط دہلی کے ایک مشہور ادارہ کا ہے جو حال ہی میں قایم ہوا ہے اور بہت تھوڑے زمانہ میں کافی ترقی کر چکا ہے۔

اس ادارہ کو جو شکایتیں انجمن ترقی اردو سے ہیں، ان کا تعلق بکثر انجمن کی کاروباری حیثیت سے ہے، جس کا ہم کو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ شکایتیں صحیح ہیں اور ان کے غیر صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، تو یہ مزید ثبوت ہیں ہمارے، اُن اعتراضات کا جو اس سے قبل کی اشاعت میں ہم نے پیش کئے تھے۔

بالکل اسی قسم کی شکایت حیدر آباد کے محکمۂ تعلیم کو بھی ہے کہ جن کتابوں کی فراہمی انجمن کے سپرد ہے وہ بروقت مہیا نہیں ہوتیں اور طلبہ کا کافی وقت انتظار میں ضایع ہوتا ہے۔

ہم کو اس کا علم نہ تھا کہ انجمن نے اپنے رسایل کی اشاعت کسی اور ادارہ کو سپرد کردی ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ بدنظمی وسہل انکاری اور کیا ہوسکتی ہے کہ انجمن خود اپنے رسایل کی اشاعت کا بھی انتظام نہیں کرسکتی۔

ہمارے پاس چودھری رحم علی الہاشمی کا خط آیا ہے جو غالباً مولوی عبدالحق صاحب کے سکریٹری ہیں یا انجمن میں کوئی اور ذمہ دارانہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے کام کے متعلق جو جو شکایتیں کی جاتی ہیں، ان سب کا جواب زیر غور ہے اور وہ انجمن کی طرف سے شایع ہونے والا ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ پر مزید اظہار خیال اس وقت تک ملتوی رکھتے ہیں، جب تک جواب شایع نہ ہو، اور چودھری صاحب موصوف کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ جواب شایع کرنے میں عجلت سے کام لیں، تاکہ جو بدگمانیاں انجمن کی طرف سے لوگوں کو پیدا ہو رہی ہیں، وہ جلد سے جلد دور ہوسکیں۔

سلامتی کا راستہ

اسوقت ہندوستان میں جو رنج دہ واقعات اور خونچکاں حوادثات رونما ہو رہے ہیں وہ اسقدر روح فرسا ہیں کہ انکے تصور سے ہی دل کانپ اٹھتا ہے۔ وہ ہندوستان جو کبھی مسرت وشادمانی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا آج وحشت ودرندگی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ زمین سے آسمان تک وحشت کی تاریکی چھائی ہوئی ہے اور اس اتھاہ اندھیرے میں انسانیت روپوش ہوچکی ہے۔

ہمارے خیال میں اب شرفِ انسانی کو بچانے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ تمام نسلی ومذہبی تعصبات ختم کرکے انسانی معاشرے کی بنیاد نسلِ آدم کی وحدت واخوت پر رکھی جائے اور تمام بنی نوع انسان کو ایک رشتۂ محبت میں منسلک کیا جائے، ان مقاصد کے پیشِ نہاد ہم نے بزم اخوت کی بنیاد رکھی ہے جس کا بڑا مقصد انسانی تہذیب وشرافت کی حفاظت اور ایسے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے جو صداقت کے پرستار اور حقایق کے قدر شناس ہوتے ہوئے انسانیت سے محبت رکھتے ہوں اور رہیت اجتماعی کی خاطر شخصی مفاد قربان کرسکتے ہوں۔ اگر آپ ان مقاصد میں ہم سے متفق ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم نوعِ انسانی کو ذلت وخواری سے نجات دلاکر انسانیت کی صحیح خدمت کرسکتے ہیں تو آیئے اور "بزم اخوت" میں شامل ہوکر ہمارا ہاتھ بٹایئے۔

بزم کی فیس رکنیت صرف ایک روپیہ سالانہ ہے۔ دستور العمل اور مفصل حالات کے لئے ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کریں:—

حیوانیات

(بعض دلچسپ حقایق)

قدرت کی بعض اصلاح طلب خامیاں

ہزاروں صدیوں سے قدرت چڑیوں میں مختلف رنگ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ چڑیوں کے پروں میں پختہ سُرخ رنگ پیدا کر سکے۔ سُرخ پروں والی چڑیاں اگر کبھی پانی میں بھیگ جاتی ہیں تو ان کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ زندہ عجائب گھروں میں اکثر یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ وہاں نہایت شوخ رنگ کی چڑیاں عجائبات سمجھ کر خریدی جاتی ہیں اور چند دن میں ان کے رنگ غائب ہو جاتے ہیں۔ بعض ماہرین علم الحیوان کا خیال ہے کہ سُرخ رنگ قدرت نے تمام رنگوں کے بعد پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ ابھی تک پختگی نہیں حاصل کر سکا ہے، چنانچہ افریقہ میں ایک سرخ رنگ کی چڑیا پائی جاتی ہے جس کا رنگ پانی میں معمولی رنگ کی طرح گھل جاتا ہے اور برسات کے زمانہ میں تو سرخ رنگ کا ایک دھبہ بھی اس کے پروں پر باقی نہیں رہ جاتا۔

اگر کوئی مالک کارخانہ جدید معلومات اور ایجادات سے فایدہ نہ اُٹھائے اور اپنے کارخانہ میں پُرانی مشینوں کے ذریعہ ہی سے کام کرانے پر مصر ہو تو لوگ اس کو ضدی اور احمق کہیں گے مگر قدرت ابتک قدامت پرست چلی آتی ہے، مثلاً گائے بیل وغیرہ میں غذا ہضم کرنے کے جو اعضا پائے جاتے ہیں وہ اب بیکار ہیں، گائے جب گھاس چرتی ہے تو وہ اس کو بغیر چبائے ہوئے نگلتی چلی جاتی ہے، اس کے بعد جگالی کرتی ہے۔ یہ طریقہ اس زمانہ میں تو ٹھیک تھا جب دنیا میں ہر طرف جنگلی درندوں کا راج تھا اور گائے کے لئے یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ دیر تک جنگل یا کھلے میدان میں گھاس چرتی رہے گی تو اس پر کوئی درندہ حملہ آور ہو جائے گا۔ ایسے زمانہ میں بیشک اس کے لئے ضروری تھا وہ جلد جلد گھاس پیٹ میں ڈال لے اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرے۔ مگر اس زمانہ میں وقت ضایع کرنے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں۔

قدرت نے جن بیکار چیزوں کو ابھی تک قایم رکھا ہے ان میں بارہ سنگھے کے سینگ بھی ہیں وہ بارہ سنگھے کے لئے ہر لحاظ سے تکلیف رساں ہیں، ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ یہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا، جتنا اس کو دوڑنا چاہئے

دشمن جب اس کا پیچھا کرتے ہیں تو اکثر اس کے سینگ جھاڑیوں میں پھنس کر اس کی موت کا باعث بن جاتے ہیں۔

اس سے زیادہ پُر لطف تماشہ یہ ہے کہ جب مادہ کے بارے میں دو بارہ سنگھوں میں لڑائی ہوتی تو بعض اوقات دونوں کے سینگ آپس میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ پھر چھوٹ نہیں پاتے اور دونوں مادہ کی ملاقات سے محروم ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے ایک تیسرا حریف آکر اس مادہ کو لے جاتا ہے۔ ان کے سینگ بسا اوقات اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ وہ چھوٹتے ہی نہیں اور دونوں غذا نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔

ایک بارہ سنگھے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سر سے مکھیاں بھگانے کی کوشش کر رہا تھا اس کوشش میں اس کا سینگ اس کی ٹانگوں میں پھنس گیا اور جب اس نے سینگ چھڑانے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

سیاہ پلیگ

جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں، منجملہ دیگر خطرات کے ایک بڑا خطرہ چیونٹیوں کا بھی ہے، جن سے جانوروں اور آدمیوں دونوں کو سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ حال ہی میں ایتھل ایڈین نے جو اپنے شوہر کے ساتھ اس نواح میں سفر کر رہی تھی، اس جنگل کا دلچسپ حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ایک دن علی الصباح جب میں اپنے شوہر کے ساتھ جوا جیر مرتھا کولمبیا کے جنگلوں میں سفر کر رہی تھی کہ میں نے دیکھا سیکڑوں چیونٹیاں نہایت جوش و انہماک سے زمین چھوڑ کر درختوں پر چڑھ رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر نہ صرف کیڑے مکوڑے بلکہ سانپ اور بعض بڑے بڑے جانور بھی اپنی جان بچا بچا کر بھاگ رہے تھے۔

اس علاقہ میں ہر سال دو مرتبہ بارش ہوتی ہے اور انھیں دنوں میں ان چیونٹیوں کے جھنڈ کے جھنڈ قرب جوار کے دیہاتوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور آج کا دن اسی خوفناک حملہ کا دن تھا۔

ہم لوگ اپنے خچروں سے قریب کے جنگل میں اُتر پڑے، یہاں ہم نے ایک لکڑی کے کندے کے نیچے چیونٹیوں کا ایک دستہ چھپا ہوا دیکھا جو ابھی تک اپنی مہم پر روانہ نہ ہوا تھا۔ تمام چیونٹیاں اپنی لمبی لمبی ٹانگیں آپس میں پھنسائے ایک گز قطر کی گولائی میں گیند کی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ یہ چمکدار سیاہ چونٹیاں تقریباً ایک انچ لمبی تھیں اور ان کے موچنے ایسے جبڑے نہایت تیز تھے۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس گیند میں حرکت ہوئی اور ساری زمین ان ننھے سپاہیوں سے ڈھک گئی اس جھنڈ میں سردار چیونٹیاں بھی تھیں جو اپنی مونچھیں ہلا ہلا کر دوسری چیونٹیوں کو ضروری حکم دے رہی تھیں اور سو سو فٹ لمبا دستہ بنا کر چل پڑی تھیں۔

چاشت کے وقت تک ہزاروں مخبر چیونٹیاں صفوں سے نکل کر ادھر اُدھر دوڑنے لگیں اور جب ایک مخبر نے لوٹ کر اطلاع دی کہ ایک چھوٹے درخت پر بہت سے کملے (کیڑے کی ایک قسم) موجود ہیں۔ تو ان چیونٹیوں کا ایک دستہ فوراً

اُس درخت پر چڑھ گیا اور کھٹملوں کا صفایا کر دیا۔

دوسرا مخبر لوٹا لیکن اس حال میں کہ اُس کی چھ ٹانگوں میں سے تین ٹوٹ چکی تھیں اور دونوں مونچھیں آدھی آدھی رہ گئی تھیں۔ اُس بیچارے کو راستہ تلاش کرنے میں بڑی دقت ہو رہی تھی کیونکہ انھیں مونچھوں سے وہ سونگھنے اور دیکھنے کا کام لیتا تھا۔ خوش قسمتی سے اُسے زخمیوں کی مدد کرنے والی چیونٹیاں مل گئیں جو اُسے اپنے سروں پر بٹھا کر فوج میں لے گئیں اُسنے بھڑوں کے ایک چھتے کا پتہ لگایا تھا جو ایک جھاڑی میں لٹکا ہوا تھا۔ فوج اس کی قیادت میں اس طرح روانہ ہوئی کہ زخمیوں کی مدد کرنے والے سپاہی ڈولی ڈنڈا کرتے ہوئے اُسے آگے آگے لئے جا رہے تھے۔

موقع پر پہونچ کر فوج نے چھتے پر حملہ بول دیا اور گو خوفزدہ بھڑوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور اپنے بچّوں اور گھر کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن بے سود۔ قلعہ فتح ہو گیا۔

دوسری صبح دن پھر قطار بنا کر چلنے کے لئے طیار ہوئیں۔ اب دوسرے دستے بھی اُن سے آکر مل گئے تھے۔ اُنکے راستے کے قریب ہی ایک اژدہا درخت کی شاخ کے گرد لپٹا سو رہا تھا جس نے ابھی ابھی ایک جنگلی سور نگلا تھا۔ چیونٹیوں نے اسے جا گھیرا۔ وہ ایسا بے خبر سو رہا تھا کہ چونٹیوں کے گچھے کے گچھے پگھلے ہوئے تارکول کی طرح اُس پر گر رہے تھے اور اسے خبر نہ تھی۔ انھوں نے اُسے اندھا کر کے کھانا شروع کیا اور شام تک اُس کی ہڈیوں کو بھی نہ چھوڑا۔

دوسرے دن پھر وہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ بیدار ہوئیں اور گاؤں کی طرف کا راستہ اختیار کیا۔ خاموش جنگل میں ان ننھی ننھی چونٹیوں کے چھوٹے چھوٹے پیروں کی چاپ بھی ایسی معلوم ہوتی تھی گویا بارش کا ہلکا چھینٹا پڑ رہا ہو۔ دفعتہً اُن میں ابتری پیدا ہونے لگی اور میمنہ و میسرہ کے محافظوں نے بڑھ کر سپہ سالار کو اطلاع دی کہ ان کے غیر مفتوح دشمن یعنی چیونٹی خور نے حملہ بول دیا ہے اور اپنی چپچپی زبان سے دستے کے دستے صاف کئے دیتا ہے۔

سامنے ہی دریا بہ رہا تھا۔ فوج جھپٹ کر وہاں پہونچی۔ کچھ چونٹیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں پکڑ کے ایک چٹان سے دوسری چٹان تک پل بنایا۔ جس پر سے دوسری چونٹیاں گزر کر اگلی چٹان تک پہونچ گئیں اور اس طرح وہاں سے وہ تیسری چٹان تک جب وہ دریا میں پہونچ گئیں تو انھوں نے فوراً اپنے آپ کو ایک گیند کی شکل میں تبدیل کر لیا لیکن بیچ میں ایک دروازہ باقی رکھا جس سے کام کرنے والی چھوٹی چونٹیاں جو بچّوں اور سامان رسد سے لدی ہوئی تھیں اندر داخل ہو گئیں اس کے بعد باقی چونٹیوں نے آکر اس قلعہ کے دروازے آپس میں جُڑ کر بند کر دئے۔ یہ جزیرہ موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا دوسرے کنارے تک پہونچ گیا جہاں سے یہ چونٹیاں قطار بنا کر اپنی اگلی مہم پر روانہ ہو گئیں۔

انھوں نے دن بھر اور رات بھر اپنا سفر جاری رکھا اُس دن ہم بھی گاؤں دیر میں پہونچے کیونکہ انکی نقل و حرکت

کا ہم ایسے انہماک سے مطالعہ کر رہے تھے لیکن ہمارا رہنما فوراً ہی چلاتا ہوا گاؤں دوڑ گیا اور سب کو اطلاع دیدی کہ چیونٹیاں آرہی ہیں، جھونپڑوں میں موم بتیاں روشن ہوگئیں۔ لڑکے چوزوں کو دبائے پہاڑی کی طرف دوڑ پڑے اور مائیں اپنے بچوں کو بغل میں دباکر بھاگیں۔ مرد اپنی گایوں کو لئے، محفوظ مقامات کی تلاش میں دوڑ پڑے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، عرصہ سے ہر چھٹے مہینے ایسا ہی ہوتا آرہا تھا۔

اس کے بعد ہی حملہ آور چیونٹیوں نے جھونپڑوں کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ہم لوگ گاؤں سے باہر ایک پہاڑی پر تھے جہاں میرے شوہر نے دو سو دیسی باشندوں کو پناہ دے رکھی تھی۔

دوسرے دن تڑکے ہم نے چیونٹیوں کو برباد کرنے کا انتظام کیا۔ دیسی باشندوں سے ہمارے مکاں کے چاروں طرف آنے جانے کے راستے کو چھوڑ کر خندق کھودی۔ جس میں لڑکوں نے سوکھے ہوئے تاڑ کے پتے بچھا دئے اور عورتوں نے کیتلیوں میں پانی کھولایا۔ دیسی لوگوں میں سے بعض نے ٹخنے سے اوپر تک ربڑ کے جوتے پہنے اور بعض نے چیتھڑے لپیٹ لئے۔ ہم لوگ بڑی بے چینی سے اپنے دشمن کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا اور اُس راستہ پر پہونچکر جو ہمارے گھر آتا تھا وہ کئی دستوں میں منقسم ہوگئیں، چھت اور دیواروں کو ڈھک لیا اور کیڑوں کو مار مار کر فرش پر گرانا شروع کر دیا۔ چمگادڑ جو چھتوں میں چپٹے سو رہے تھے ان پر حملہ کیا گیا اور ختم کر دیا گیا۔ وہ چونٹیاں جو نیچے منتظر تھیں گرنے والے چمگادڑوں کو کھانے کے لئے آنگن میں گھسیٹ لے گئیں۔ کچھ دستے چوہوں کی تلاش میں کوٹھریوں کے اندر گھس گئیں اور کچھ نے دیمک کی تلاش میں کتابوں والی الماریوں پر دھاوا بول دیا۔

جب سب چونٹیاں اندر داخل ہوگئیں تو ہم لوگوں نے جلدی سے آمد و رفت کے راستے کو بھی کھود ڈالا۔ چھ گھنٹے تک ہم اُن کے باہر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر وہ برآمد ہوئیں۔

ہم نے جلدی سے گرم پانی میں موم بتیاں پگھلائیں اور تاڑ کے پتوں پر مٹی کا تیل انڈیل کر آگ لگا دی۔ کچھ لوگوں نے دوڑ دوڑ کر بیلچوں سے انھیں خندق میں گرانا شروع کر دیا۔ صفیں کی صفیں گرم پانی میں ڈبو دی گئیں اور انھیں پگھلے ہوئے موم سے ڈھک دیا گیا۔ اس طرح یہ خوفناک بلا ٹل گئی اور ہمارے گاؤں میں ایک مرتبہ پھر امن ہوگیا۔

زیر طبع

من و یزداں

حضرت نیاز کے مذہبی مقالات

مطالعاتِ نیاز

تاریخی و علمی مقالات کا مجموعہ

قانون وانصاف

مشتعل دشت وجبل، جھلسے ہوئے برگ وثمر
سرخیوں میں آگ کی لپٹی ہوئی اک دوپہر

زندگی شام وسحر کی جنتوں سے دور دور
آسماں پر شاہِ خاور کی جوانی کا غرور

یہ دھواں دیتی چٹانیں، یہ شعاعوں کے مزار
گرم کرنیں، جیسے بہتی آگ کا اک آبشار

وقت کے لمحات تھے مصروف دیپک راگ میں
ڈھل رہے تھے جگنوؤں کے قہقہے بھی آگ میں،

زیست کے ایواں پہ تو دیتے ہوئے پرچم بلند
جیسے جنت پر ہو دوزخ کے عذابوں کی کمند

راستہ پر ایک بڑھیا دفعتہً آئی نظر
آندھیوں سے مٹ چکا تھا جسکا خطِ رہگذر

جس کے شانوں پر ہزاروں گردشوں کے بار تھے
جس کی لاغر پشت پر ایام کے انبار تھے

جس کے چہرہ پر ہزاروں انقلابوں کی خراش
ہوچکا تھا شیشۂ احساس جس کا پاش پاش،

جس کی آنکھیں اپنے کھوئے نور پر اندوہگیں
آنسوؤں کی خشک سالی کے دفینوں کی امین

صبح ہی سے ہوگیا تھا زرد جس کا آفتاب
بجھ چکا تھا شام ہوتے ہی چراغِ ماہتاب

اپنے ماضی کا وہ جیتا جاگتا اک تذکرہ،
اپنے مستقبل کے افسانہ پہ زندہ تبصرہ

مجھ سے یوں کہنے لگی، تو بھی تو ہے شاید وکیل
کیا نہیں تیری کتابوں میں کوئی ایسی دلیل

جس سے ٹکرا جائیں یہ قانون کے کاغذ کے پھول
یہ منات ولاتِ، یہ انصاف کے جھوٹے رسول

عدل کے کچھ بوجہل، قانون کے کچھ بولہب
خونِ مہر و ماہ کی جن کے اندھیروں کو طلب

ہائے وہ انصاف جسنے سیم وزر کی چھاؤں میں
ڈال دی ہیں بیڑیاں اک بے گنہ کے پاؤں میں

دل بھی صدقہ کر چکی قانون کے الطاف پر
رکھدو استدلال کا نشتر رگِ انصاف پر

کتنی ماؤں کے کلیجے ہوچکے ہیں غم سے شق،
سینۂ گیتی پہ کیوں برسا نہیں خونِ شفق؟

کیا مشیت کے خزانے میں کوئی طوفاں نہیں؟
کیسۂ فطرت میں کیا اب درد کا ساماں نہیں؟

اے زمیں پر بھٹکی بھٹکی سی جہنم کی فضا!
عدل کی محراب کی شمعوں کو پھونکوں سے بجھا

ریحان الحسن فاروقی

کلام ادیب سہارنپوری:

نہ جانتا تھا کہ اک دن پیش یہ باتیں بھی آئیں گی،
ستم کے ساتھ یاد اُن کی مداراتیں بھی آئیں گی

شرارے پے بہ پے اُٹھیں گے ان بے خواب آنکھوں سے
خبر کیا تھی کچھ ایسی چاندنی راتیں بھی آئیں گی

نہ کام حوصلے آئے نہ ولولے آئے،
رہِ وفا میں کچھ ایسے بھی مرحلے آئے

حواس و ہوش تو کیا کائنات کانپ گئی
کبھی کبھی تو دلوں میں وہ زلزلے آئے

فریبِ وعدۂ فردا کسے گوارا ہو،
وہ بُت خدا کو اگر درمیاں نہ لائے

دل کا یہ تقاضا کہ وہ جلدی سے گزر جائیں
آنکھوں کی تمنا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں

خوش ہیں کہ ستمگر اُنھیں کہتا ہے زمانہ
لیکن یہ غضب ہے کوئی پوچھے تو مکر جائیں

یہ جوشِ بہاراں یہ ہوائیں یہ گھٹائیں
دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں

مشکل ہے کہ رُکنے دے ہمیں حسرتِ پرواز
ممکن ہے کہ تھک کر یہ شب و روز ٹھہر جائیں،

بڑھتا ہی جا رہا ہے شعورِ خود آگہی
ناکام اُٹھ گیا تھا ترے آستاں سے کون

ہم نے وہ روز و شب بھی گزارے ہیں اُن سے دور
لمحے جہاں گزر گئے صدیاں لئے ہوئے

ادارۂ "نئی زندگی" کا معرکہ آرا اقدام

سیاسی ادب میں قابل قدر اضافہ

اُردو کا واحد بین الاقوامی مصوّر ماہنامہ

جہاں نما

شایع ہوگیا

اب کہ ہندوستان آزادی کی نئی وسعتوں میں قدم رکھنے والا اور بین الاقوامی سیاسیات میں آزاد حکومت کی حیثیت سے حصہ لینے والا ہے یہ انتہائی ضروری ہوگیا ہے کہ ہر ہندوستانی اب اپنی محدود دنیا سے نظر آگے بڑھائے اور اپنے پڑوسی اور دوسرے ممالک کی سیاست سے واقف ہو۔ دُنیا کے چند اہم ممالک میں ہمارے سفارتخانے کھل چکے ہیں اور دوسرے ممالک میں کھلنے والے ہیں۔ تیسری جنگ عظیم کی گھٹائیں چھا رہی ہیں جس میں ہمیں تماشائی بن کے رہنا نہیں اسلئے ہندوستان کو ایک خارجی پالیسی متعین کرنے کی ضرورت ہے اور دُنیا کی قوتوں میں بڑی دانشمندی سے اپنے دوستوں کا انتخاب کرنا ہے۔ ایسی صورت میں ہر پڑھے لکھے ہندوستانی کو دوسرے ممالک کے حالات سے دلچسپی لینے اور انکی سیاسی پیچیدگیوں سے باخبر رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

سیاسیات عالم پر اہم مقالات، بین الاقوامی مسائل پر بصیرت افروز تبصرے ___ انجمن اقوام متحدہ کی کارروائیوں پر بے لاگ تنقیدیں، بین الاقوامی شخصیتوں کے حالات، ممالک اسلامی، مشرق بعید، بحیرہ روم، افریقہ، یورپ، روس، امریکہ کے متعلق معلومات افزا مضامین اس کے اہم اجزا ہوں گے۔

ایڈیٹر۔ سید انیس الرحمٰن ___ سائز ۲۲ × ۱۸/۸ ڈیمی ۶۴ صفحات ___ سالانہ: چار روپے ___ فی پرچہ: چھ آنے

منیجر رسالہ "جہاں نما" ۹۰ میوٹ روڈ الہ آباد

اُردو کو مفید اور زندہ لٹریچر سے مالامال کرنے کے لئے جہاں نما کی سرپرستی فرمایئے

کلام: ندیم جعفری، ڈیرہ غازی خاں

مسرت مچلتی ہے آج اس جبیں پر — نوازش ہے کس جانِ اندوہگیں پر،

مجھے کیونکر نہ ہوگی شاد کامی، — درِ جاناں کی حاصل ہے غلامی
مرے لب کس لئے ہوں وقفِ شکوہ — کہ جاری ہے جفائے التزامی
جفائے یار کی مشقِ فراواں، — مری ایذا پسندی کی ہے خامی

بہار آئی گلستانِ نظر میں، — عجب شے ہے ترا دستِ حنائی
کہاں میں اور کہاں وہ شاہ خوباں، — عبث ہیں شکوہ ہائے نارسائی

مری رودادِ غم فِرامت پوچھ — دل لرزتا ہے اِس کہانی سے

ہر چند مٹ چکا ہے ندیم ارتباطِ شوق — آتی ہے پھر بھی یادِ محبت کبھی کبھی
حسرتِ دید بہ امکانِ نظر باقی ہے، — یعنی الزامِ محبت میرے سر باقی ہے
کشتیٔ عشق کو تا ساحلِ مقصد لے چل — جوشِ گریہ اگر اے دیدۂ تر باقی ہے

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے:۔

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسبِ ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے:۔

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

مشہور سیاسی رسالہ نئی زندگی کا

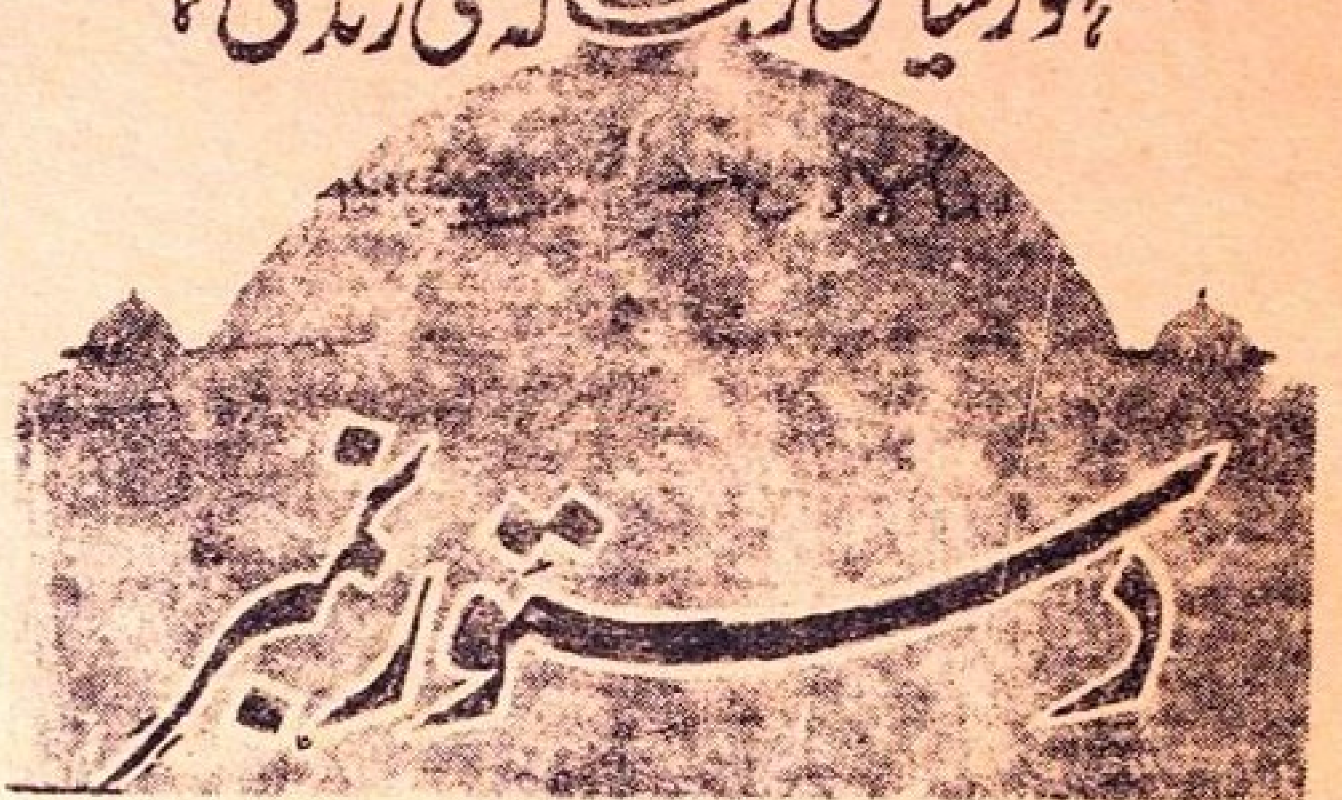

لکھنے والے ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر ہمایوں کبیر، سید عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، ڈاکٹر ایشوری پرشاد، پروفیسر کے۔ ٹی شاہ، ڈاکٹر سید محمود، ام۔ آر مسانی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سر شفاعت احمد خاں، شانتی سروپ دھون، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، ڈاکٹر سید حسین، علامہ رشید رضا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سعد سجاد ظہیر، ل۔ احمد اکبرآبادی ــــ اور دوسرے ماہرین آئین و دستور حصہ لینے والے ہیں

چند عنوانات ــــــــ [ایڈیٹر:ــ سید انیس الرحمٰن

دستور کی تاریخ ــــ یونان، روما اور عہد وسطیٰ کے دستور ــــ جمہوریت کہاں ہے؟ ــــ امریکہ اور عدالتوں کا نمونہ ــــ ہندوستان کی دستوری ترقی پر سیاسی تحریکوں کا اثر ــــ بین الاقوامی نظریات اور واقعات کا اثر ــــ ہندوستان کی آئینی ما ہیئت ــــ سمجھوتے کی تاریخ ــــ ہندوستان کے لئے ایک مثالی دستور ــــ پاکستان کے لئے ایک مثالی دستور ــــ قرآن کا سیاسی نظام ــــ حکومت کی مشینری ــــ سوشلسٹ نظام حکومت ــــ مرکزی اور صوبائی اختیارات ــــ اقلیتوں کے مسئلے کا حل کیا ہو ــــ ریاستوں اور مرکز کے تعلقات ــــ وفاقی مالیات ــــ صوبوں کی لسانی تقسیم ــــ برطانیہ کے ساتھ صلحنامے کے خطوط ــــ آزاد ہندوستان کی ایک تصویر ــــ آزاد ہندوستان میں افراد ــــ ہندوستانی یونین کا مقصد کیا ہو ــــ جنگ کے بعد ملک کی دستور ساز مجلسیں ــــ آئرلینڈ کی دستوری آزادی ــــ دنیا کے بعض منتخب ملکوں کے دستور

علاوہ ازیں تمام اعلانات، اعداد و شمار، اور متعلقہ سیاسی دستاویز بطور ضمیمہ شامل ہوں گے

اردو میں اب تک کوئی ایسی سیاسی اور تعمیری کتاب شائع نہ ہوئی

حجم ۲۰۰ صفحات　　**قیمت فی جلد تین روپئے**　　سالانہ چندہ ستے روپئے

سالانہ خریداروں کو مفت ــــ مشتہرین حضرات جلد توجہ فرمائیں ــــ ایجنٹ جلد اپنے آرڈر ارسال کریں

قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں، وی۔ پی نہ بھیجا جائیگا

مینیجر رسالہ "نئی زندگی" ۹۰ ہیوٹ روڈ الہ آباد

مستقل خریدار بن جائیے

تصوف اور اُردو شاعری

از پروفیسر سید صفی حیدر دانش ایم اے

اُردو شاعری فارسی کی گود میں پلی اور گو فارسی کے تمام شاعر صوفی نہ تھے لیکن ان میں آپ کو ایک بھی ایسا نہ ملے گا، جس نے ذہنی شاعری میں سوز و گداز، رفعتِ تخیل، اور پاکیزگی خیالات پیدا کرنے کے لئے تصوف سے مدد نہ لی ہو، اُردو شعرا کو تصوف کی یہ چاٹ ورثہ میں ملی۔ چنانچہ تصوف کے واردات و حقایق اور اسکی اصطلاحات اُردو شاعری میں کچھ اس طرح رچ گئی ہیں کہ جب تک تصوف کا علمی پسِ منظر اور اس کے باطنی احوال و کوائف کا خاکہ ہمارے سامنے نہ ہو، اُردو شاعری کے فن پاروں سے صحیح معنوں میں محظوظ ہونا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے شروع میں تصوف کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے بعد تصوف کے وہ مسایل جن کا اُردو شاعری میں بار بار ذکر آتا ہے، اُن کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ساتھ نمونے کے اشعار بھی دئیے ہیں۔ اس کتاب میں تصوف کے دقیق حقایق کو مصنف نے ایک محقق عالم کی طرح سلجھایا ہے اور اُردو شاعری کے محاسن کو ایک صاحبِ ذوق ادیب کی طرح پیش فرمایا ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

چند نئی کتابیں

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ --- ۱۲/ عہ

مشاہدات و معارف تصوف --- پروفیسر محمد سرور۔ للعہ

کاروانِ خیال --- مولانا ابوالکلام کے خطوط --- ۸/ عہ

ترجمان القرآن جلد اول طبع دوم مجلد ۱۲/ عہ غیر مجلد ۸/ عہ جلد دوم ۱۲/ عـہ

ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب -- ڈاکٹر عابد حسین عـہ

مسلمان اور غیر مسلم حکومت ــ سیاست حاضرہ پر ایک تبصرہ ۸/ عہ

تلاشِ ہند (اُردو ترجمہ) -- پنڈت جواہر لال نہرو ۱۲/ عـہ

ارتقائی اشتراکیت (اُردو ترجمہ) سی، ای، ایم جوڈ --- ۸/ عہ

صحیفہ سلطان ٹیپو ــ جلد اول ---- محمود مورخ ــ للعہ

تعلیمی خطبات، بار دوم -- ڈاکٹر ذاکر حسین --- ۸/ عہ

ذاکر صاحب ----- رشید احمد صدیقی ---- ۸/ عہ

شبلی نامہ ---اکرام ــ مولانا کا ایک شخصی تجزیہ --- سے

خطوط مشاہیر --- مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی -- سے

نئے پُرانے چراغ (تنقید) ــ آل احمد سرور ----- للعہ

اقادی ادب (") اختر انصاری ------ ۸/ عہ

خانہ جنگی (ڈرامہ) محمد مجیب ــ دارا اور اورنگ زیب کی لڑائی ــ ۸/ عہ

امراؤ جان ادا ــ ناول ---- مرزا رسوا ---- ۸/ عہ

ستاروں سے آگے ــ افسانے ... قرۃ العین حیدر -- للعہ

سندھ ساگر اکاڈمی۔ ۵۸ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ ۔ مشکی قوام ۔ الائچی دانہ ۔ تیل ۔ عطر ۔ عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمایئے

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون: ہوڑہ، ۴۵۵

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری ۔ ۱۴۱ ۔ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱— چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲— مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ
علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے۔ زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومنؔ، ظفرؔ، غالبؔ، مصحفیؔ، نظیرؔ، سیمابؔ، جوشؔ، اصغرؔ وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں تمام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصہ اول للعہ۔ حصہ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

زیر طبع

مطالعات نیاز

حضرت نیاز کے علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

من و یزداں

حضرت نیاز فتحپوری کے ان مذہبی مقالات کا مجموعہ جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء	جنوری سنہ ۴۰ء	جنوری سنہ ۴۱ء	جنوری سنہ ۴۲ء	جنوری سنہ ۴۳ء
(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: حیات مصحفی۔ اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں: نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ نظیر اور عوام انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ	یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔	اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔	اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت تین روپیہ علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء (قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر فسٹڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں۔ حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ —— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔ قیمت ہر حصہ کی ؎عہ۔

جنوری سنہ ۴۷ء اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۴۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ	۲۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند دس روپیہ۔

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

—— کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات

—— اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

مطبوعہ نگار پریس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر: ایم حسین)